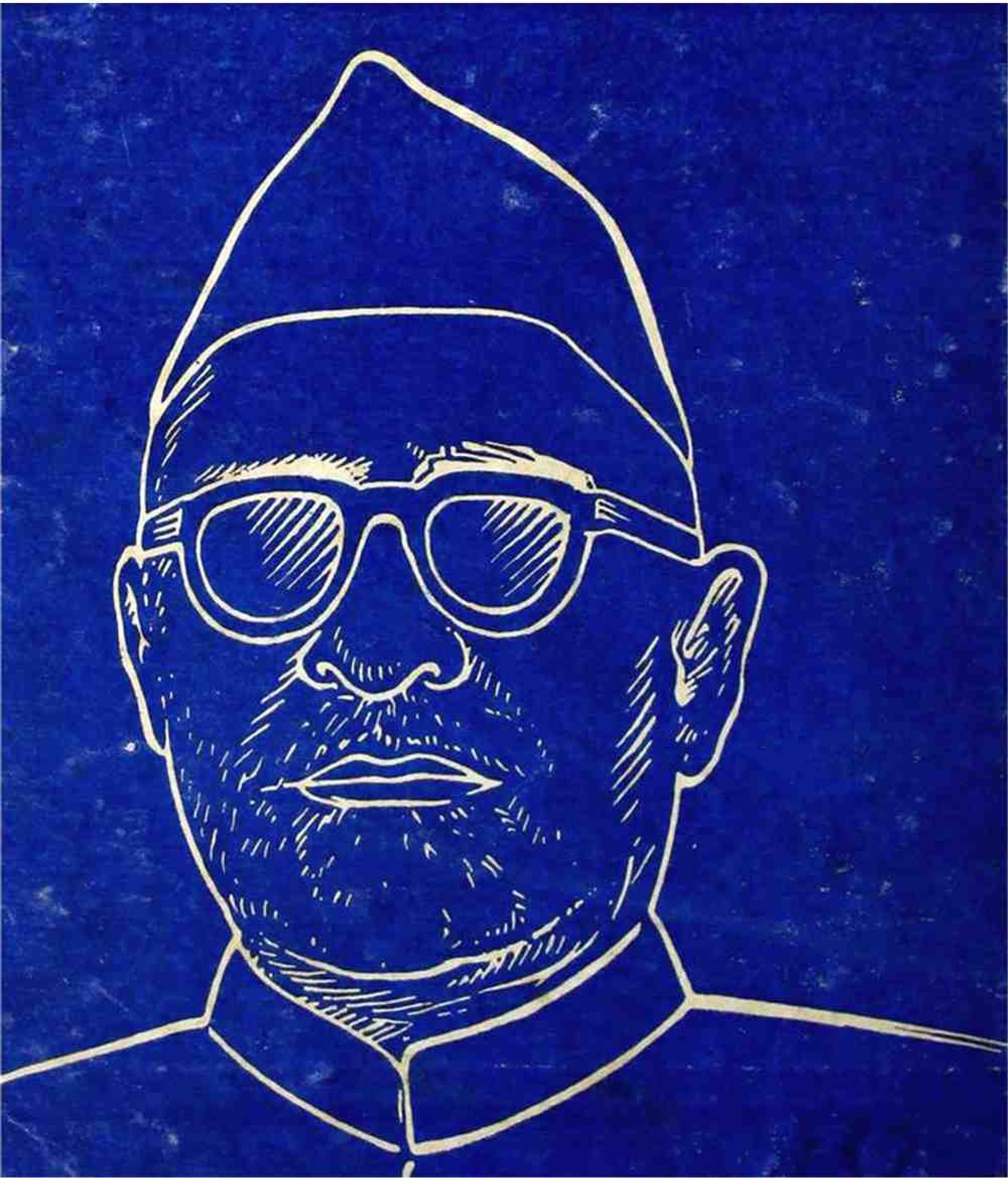
ڈاکٹر ذاکر حسین



ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر ذاکر حسین

ناشر ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی (رجسٹرڈ) حیدرآباد

ملنے کا پتہ ۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو
کنارا بنک بلڈنگ
عابد روڈ ۔ حیدرآباد ۱

سال اشاعت ۔ اگست ۱۹۷۲ء

کاتب ۔ م ۔ ع ۔ رشید
سنگساز ۔ س ۔ ع ۔ سید عبدالرزاق
طابع ۔ رفیق مشین پریس
حیدرآباد ۲

قیمت ۔ دس روپے

انتساب

ہندوستان کے عظیم سپوت، دانشور، مفکر اور سیاسی رہنما
جواہر لال نہرو
کے نام جن کی انقلابی انسان دوستی نے جامعہ ملیہ کے ایک گوشہ سے ذاکر صاحب کو ڈھونڈھ نکالا، اور انھیں تراش کر ایک ایسا ہیرا بنایا، جو آزاد ہندوستان کی انگشتری کا سب سے تابدار نگینہ بن گیا جواہر لال کی نگاہِ انتخاب میں جچنے والی اس شخصیت کو معلم سے نائب صدر جمہوریہ کے عہدہ تک پہونچانے میں خود ان کا دخل رہا اور اس کے بعد ان کی صاحبزادی شریمتی اندرا گاندھی نے انھیں ملک کے سب سے جلیل القدر عہدہ صدارت پر فایز کر کے اپنے والد محترم کے "سیکولر نصب العین" کو عملی جامہ پہنایا۔ اس "دیدہ ور" کو پہچاننے والی یہ آنکھیں بھی کتنی "جوہر شناس" نہیں ہونگی۔

فہرست

تذکرہ

پیشِ لفظ

ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی حیدرآباد کے صدر نشین کی حیثیت سے مجھے بیحد خوشی ہے کہ ہم اپنے محبوب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی عظیم قومی خدمات کے اعتراف میں یہ کتاب پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا شمار ہمارے ملک کے منفرد دانشوروں میں ہوتا ہے۔ اپنے واضح نصب العین کی تکمیل میں انہوں نے بے مثال ذہنی ذہانت داری، شجاعت و بیباکی اور بے لوث وطن دوستی کا بڑا دلکش نقش چھوڑا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک ماہر تعلیم تھے، اور اپنی ساری زندگی انھوں نے اپنے ملک کے عوام کے شعور کو جلا دینے کے لئے وقف کردی تھی وہ تعلیم کے مختلف طریقوں کے تجربات میں مصروف رہے، اور بعض انتہائی سادہ لیکن اثر آفریں طریقوں کو رواج دیا اوکھلہ (دہلی) کی جامعہ ملیہ جس کے وہ بانی تھے ان کی "عظمت فکر" کا جیتا جاگتا مظہر ہے۔ ان کی کوشش یہی رہی کہ وہ تعلیم کے ذریعہ قومی زندگی میں داخل ہوجانے والی کثافتوں اور خباثتوں کو دور کریں۔

ڈاکٹر صاحب جیسے ذہین آدمی کے لئے یہ بات بہت آسان تھی کہ وہ کوئی اور پیشہ اختیار کرکے، دولت کماتے، اور خوشحال زندگی گذارتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے اپنا رشتہ جوڑ کر دیکھتے ہی دیکھتے بڑے لیڈر بن جاتے۔ لیکن اپنے ملک کے عوام کو علم سے بہرہ ور کرنے کی جو شمع ان کے دل میں روشن تھی اس نے انھیں کوئی اور راستہ اختیار کرنے نہ دیا۔ یہ درست ہے کہ سیاست سے ان کا راست تعلق نہیں رہا۔ لیکن مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے جلیل القدر قائدین کو بھی ڈاکٹر صاحب کی بے لوث خدمت گذاری متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

ذاکر صاحب کا پہلے نائب صدر جمہوریہ، اور بعد میں صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے

انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ملک کے عوام، اور قائدین ماہرین تعلیم کا کتنا احترام کرتے ہیں۔

ملک کے سب سے جلیل القدر عہدہ پر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا انتخاب ہمارے ملک کے سیکولر دستور کی سب سے بڑی فتح تھی خاص طور پر یہ کہ شریمتی اندرا گاندھی کی نظر جوہر شناس کا وہ عظیم کارنامہ ہے جنھوں نے شدید مخالفت کے باوجود ذاکر صاحب کو اس مسند جلیلہ پر لا بٹھایا اور جس سے ہندوستان کا سر فخر دنیا میں اور بھی بلند ہو گیا۔

یہ ہماری بدبختی تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی میعاد صدارت کے اختتام سے پہلے ہی وہ موت کی سرد آغوش میں پہونچ گئے ـــــ اور ہم ان کی رہنمائی سے محروم ہو گئے تاہم اپنے مختصر سے دور صدارت میں انہوں نے اپنے ملک کے عوام کی صلاح و فلاح کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ان سے ممکن تھا۔

زیر نظر کتاب " ڈاکٹر ذاکر حسین " ـــ حیدرآباد کے ممتاز صحافی اور ادیب جناب احسن علی مرزا کی انتھک ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ قابل تعریف قابلیت اور مستعدی سے اس فرض سے عہدہ برآ ہوئے ہیں ۔

بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر کمیٹی کے ان ارکان کا ذکر کیا جائے جن کی پُر خلوص کوشش سے اس کتاب کی اشاعت کا کام تکمیل کو پہونچا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی کے عہداروں نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

میں کمیٹی کی جانب سے ان عطیہ دہندگان کا بھی مشکور ہوں جن کی اعانت ڈاکٹر صاحب کی زندگی پر ایک جامع کتاب کی اشاعت کے خواب کو تعبیر دینے کا سبب بنی۔

حمایت نگر۔

محمد ابراھیم علی انصاری

دیباچہ

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم علم و ادب اور فکر و نظر کا ایک شاہکار عظیم تھے، ان کے ادبی و تعلیمی کارناموں نے دنیائے فکر و علم کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کیا ہے زمانۂ طالب علمی سے لیکر آخر دم تک انھوں نے فکر و بصیرت کی جو شمعیں روشن کی ہیں ان کی تابناکی جہالت کے دھندلکوں کو چیر کر، انسانیت کو منزلِ مقصود کا ایک نیا راستہ دکھاتی ہے، ان کی زندگی کے مختلف روپ عوام کے سامنے آتے ہیں اور ہر روپ میں وہ ایک منفرد شخصیت کے حامل دکھائی دیتے ہیں، ان کی زندگی کے یہ مختلف ادوار قوم کی رہبری، اور عوامی شعور کی تربیت میں ایک مصلح کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں

ذاکر صاحب ایک مستحکم کردار کے حامل فرد، اور ایک سرکردہ ماہر تعلیم ہی نہیں بلکہ اردو کے چوٹی کے انشاء پرداز بھی تھے۔ ان کے اندازِ فکر پر کسی بندھے ٹکے مکتب کی چھاپ نہیں تھی

ہر موضوع پر ان کا مطالعہ تحقیقی اور گہرا تھا، ان کا علم صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں بلکہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی خدمت کا وسیلہ بھی تھا۔ ان کی یہ انفرادی خصوصیت ایک انوکھے زاویۂ نظر کی ترجمان بن جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم پر کئی قابل مصنفین نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کی شخصیت، سیرت، کردار اور تعلیمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

زیر نظر کتاب ذاکر حسین صاحب کی ذات گرامی پر ایک اچھے اضافہ کی مخلصانہ کوشش ہے۔ حیدرآباد کے ممتاز صحافی مسٹر احسن علی مرزا نے محنت شاقہ سے کام لیکر ذاکر صاحب کی زندگی کو اس کتاب میں سمونے کی قابل تعریف کوشش کی ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب نہ صرف پڑھنے والوں کو ذاکر صاحب کے عظیم کارناموں سے واقف کرانے کا ذریعہ بنے گی، بلکہ ان میں خدمت خلق کا ایک نیا ولولہ، ایک نئی امنگ، اور ایک نیا حوصلہ پیدا کرنے کی موجب بنے گی۔

مُراد نگر۔ سید رحمت علی

عرضِ حال

مئی سنہ ۱۹۷۱ء میں بعض دانشوروں، مفکروں، صحافیوں اور ممتاز شخصیتوں نے حیدرآباد میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند کی یاد میں ایک انجمن ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔

اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد میں جہاں ذاکر صاحب کے افکار و خیالات کا عوام میں پرچار کرنا ہے وہیں نئی نسل کو ان کے پرخلوص قومی خدمات اور ان کے عظیم تعلیمی کارناموں سے واقف کرانا ہے۔ یہ امر باعثِ فخر ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی کی اولین کتابی پیش کش جو ذاکر صاحب کی شخصیت و سیرت سے متعلق وسیع معلومات کی حامل ہے آپ کی خدمت میں پیش ہے اس کتاب کی اشاعت کا سہرا کمیٹی کے صدر جناب محمد ابراھیم علی انصاری وزیر طبابت و صحت عامہ حکومت آندھرا پردیش کے سر ہے، جن کی شخصی دلچسپیوں اور سرپرستی نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا اس یادگاری کتاب کی ترتیب اور اشاعت کا کام کوئی آسان کام نہ تھا۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ ذاکر صاحب کی زندگی اور ان کے عظیم کارناموں پر کئی ممتاز مصنفین کی مختلف موضوعات پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں تاہم یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ ذاکر صاحب کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ایک معیاری اور اچھی کتاب اردو میں پیش کی جائے، اس کے پیش نظر یہ طے کیا گیا کہ ذاکر صاحب پر ایسی کتاب کی ترتیب و تدوین کا کام اردو کے کسی ایسے ادیب کے سپرد کیا جائے، جو ادب اور سیاست، دونوں ہی موضوعات پر لکھتا رہا ہو کمیٹی نے اس کام کے لیے جناب احسن علی مرزا صاحب کا انتخاب کیا۔

ہمیں خوشی ہے کہ جناب احسن علی مرزا صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پر شائع شدہ کئی کتابوں، مقالوں، اور رسالوں کے عمیق مطالعہ کے بعد اس شہ پارہ کو ترتیب دیا۔ اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے کمیٹی ان کو مبارکباد دیتی ہے۔

آخر میں ہم ان تمام مخلص اور کرم فرما اصحاب کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنہوں نے دامے، درمے، اور سخنے اس کتاب کی اشاعت میں ہم سے بڑا تعاون فرمایا ـــــ بے محل نہ ہوگا اگر ہم اسٹیٹ لائبریری آندھرا پردیش، عرشی لائبریری درگاہ یوسفین، برانچ لائبریری میسرم کے علاوہ دیگر کتب خانوں کے ارباب مجاز کا شکریہ ادا نہ کریں جن کے پرخلوص تعاون کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہوتی۔

اس کے علاوہ ہم جناب خیرات ندیم صاحب، فکر حیدرآبادی صاحب، جناب منیر جمالی صاحب ایڈیٹر "لیڈر" جناب عارف الدین سلیم صاحب نامہ نگار خصوصی روزنامہ ملاپ، اور جناب محمد یعقوب نور صاحب، جناب حذاقی صاحب اراکین کمیٹی کے مشکور ہیں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں شخصی دلچسپی لی اور اپنا قیمتی وقت دیا۔

ہمیں یقین ہے کہ اس یادگاری کتاب کو صاحبانِ ذوق بڑی دلچسپی سے پڑھیں گے۔

علاوہ ازایں ذاکر حسین میموریل کمیٹی نے ذاکر صاحب کے تعلیمی کارناموں کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچانے کے لئے معلوماتی کتابوں کی اشاعت کا ایک وسیع لائحہ عمل مرتب کیا ہے جو یقیناً عوامی شعور کی تربیت میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔

ہمیں یقین ہے کہ آئندہ بھی عوام کا پرخلوص تعاون حاصل رہے گا۔

حمایت سنگھ　　　　　　　　　　　　سبودھ کمار سین

حرفِ آخر

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دور' اور ہر زمانہ میں بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں بجا طور پر تاریخ ساز کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا شمار بھی انھیں تاریخ ساز ہستیوں اور عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے، جن کی عظمت کا اعتراف نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا نے کیا ہے۔

انھوں نے اپنے پیچھے افکار و کردار کے ایسے روشن نقوش چھوڑے ہیں جو عرصہ دراز تک آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بنے رہیں گے۔

ذاکر صاحب نے تعلیمی میدان میں کچھ ایسے انوکھے تجربے کئے جن کی وجہ سے تعلیمی اور سماجی اقدار، نظریات کی شرح و تعبیر میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان انقلابات نے قدرتی طور پر ان کے بہت سے مخالف پیدا کر دیئے، جیسا کہ تاریخ کے ہر دور میں ہوتا آیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے نظریات نے لاکھوں دلوں کو فتح کر لیا۔ حتیٰ کہ ان کے بدترین ناقدوں نے بھی ان کا لوہا مان لیا۔

ذاکر صاحب کی ہستی خدمتِ قوم و وطن کے لئے وقف تھی، ان کا غم قوم کا غم، ان کی فکر قوم کی فکر تھی، انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو عالم انسانیت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ان کو کبھی بھی شہرت، دولت، اور مرتبہ کی فکر نہیں رہی۔ ان کو تو بس اپنا پیغام علم و دانش زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہونچانے کی فکر دامن گیر رہی اور بلا شبہ وہ اپنے اس مشن میں کامیاب رہے۔ اگرچہ کہ ذاکر صاحب نے اپنی سرگرمیوں کو زیادہ تر تعلیمی خدمات، اور سماجی اصلاحات تک محدود رکھا تھا۔ اور عملاً سیاست سے اپنا دامن بچائے رہے لیکن اس کے باوجود ہندستان کی جدو جہد آزادی سے لیکر حصولِ آزادی کے بعد کے زمانہ میں بھی ان کا جذبۂ خدمتِ خلق اور پیغام خلوص و محبت، سیاست کے ہولناک طوفان میں

بھی ایک سنگلاخ چٹان کی طرح اٹل رہا۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

ایک معلم سے لیکر صدر جمہوریہ ہند تک، ان کی زندگی خدمتِ خلق کے عظیم جذبات اور بے مثال واقعات سے بھرپور ہے۔ بجست و افلاس اور معاشی بحران کے بدترین ایام میں بھی ان کے قدم کبھی ڈگمگانے نہیں پائے، بلکہ وہ استقلال سے اپنی منزل کی طرف آگے ہی بڑھتے رہے، اور اف تک نہیں کیا جب تک کہ خود منزل نے آگے بڑھ کر ان کے قدم چوم نہیں لئے۔

ذاکر صاحب کی ناقابل فراموش جدوجہد، قربانیوں، اور علمی خدمات سے بھرپور کتاب "ڈاکٹر ذاکر حسین" آپ کی خدمت میں ذاکر حسین میموریل کمیٹی کی جانب سے پیش کی جارہی ہے جس کو حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق ادیب وصحافی احسن علی مرزا صاحب نے مہینوں ریسرچ اور عمیق مطالعہ کے بعد تصنیف کیا ہے۔ مرزا صاحب کی یہ ادبی کاوش اس لئے بھی دلچسپ ہے کہ اسے انھوں نے اپنے مخصوص اندازِ تحریر اور شگفتہ اسلوب سے سنوارا ہے ہمیں یقین ہے کہ عوام ان کی اس ادبی کاوش کو ضرور پسند کرینگے۔ آخر میں ہم جناب محمد ابراھیم علی انصاری صاحب وزیر طبابت وصحت عامہ حکومت آندھرا پردیش وصدرنشین ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی کی پرخلوص مساعی، اور شخصی دلچسپیوں کو خراج تحسین پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے اپنی دوسری اہم مصروفیات کے باوجود اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔۔۔

فکر حیدرآبادی

علی احمد حذقی

ڈاکٹر ذاکر حسین

سیرت و شخصیت

احسن علی مرزا

ڈاکٹر ذاکر حسین

سیرت و شخصیت

احسن علی مرزا

مسلمان اور جنگ آزادی

ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں بعض گوشے یہ باور کرتے ہیں کہ' وہ قومی دھارے سے دور ہیں۔ یہ بات ان ہی لوگوں کی طرف سے کہی جاتی ہے' جو یا تو ہندستان کی تحریک آزادی کے مختلف مرحلوں سے واقف نہیں یا پھر ہماری تاریخ کو مسخ کرنے کی دانستہ کوشش میں ہیں۔

یہ کوئی راز نہیں ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے تحریک آزادی میں نہ صرف حصہ لیا' بلکہ مردان مجاہد کی طرح سرفروشی کی مثال بھی قائم کی ہے۔ علی برادران، حکیم اجمل خاں' ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام تو' روز ہی سننے میں آتے ہیں۔ یہ سب جنگ آزادی کے ہراول دستہ میں شامل تھے۔ لیکن کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں' جنھوں نے بڑی خاموشی سے ہماری فکر و نظر کا نیا راستہ متعین کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین آزادی کے ہنگامہ خیز دور میں چپکے سے داخل ہوتے' اور جامعہ ملیہ کو سنبھال لیا تاکہ' آزادی کی شمع سے مسلمانوں کی اس نئی نسل کے دل بھی روشن ہوسکیں' جسے سرسید کی بلند حوصلگی نے مغربی علوم کا تحفہ تو عطا کیا تھا لیکن جس کے دماغ پر برطانوی سامراج کی دھاک سی بیٹھ گئی تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کی عکاسی کے لئے اس عہد کے نمایاں خط و خال کی وضاحت

ضروری ہے، جس کی کوکھ سے مسلم دانشوروں کی ایک پیڑھی نے جنم لیا تھا۔ ہندستان کی جنگ آزادی کے اس عہد کو چار مختلف حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے ـــــ پہلا دور وہابیوں کی مسلح جدوجہد، اور آگہی ہوگا، کے انقلابیوں کا ہے، جو ۱۸۳۲ء سے شروع ہوا ـــــ دوسرا دور ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۸ء تک ہے، جو دستوری ایجی ٹیشن تک محدود رہا ـــــ تیسرا دور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۲ء تک کی عوامی تحریک کا ہے۔ اور سب سے آخر میں انقلابی تحریک کا دور آتا ہے، جو ۱۹۴۷ء میں ہندستان کی آزادی پر اختتام کو پہونچا۔

آزادیٔ وطن کے ان چار مرحلوں میں ہمیں کتنے ہی مسلمان، دیگر محبان وطن کے کندھے سے کندھا ملائے منزل مقصود کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ وہابی تحریک اور آگہی ہوگا۔ انقلابیوں کی جدوجہد کے ابتدائی مرحلوں کا تذکرہ بے محل ہوگا، کیونکہ تحریک آزادی کے ان دونوں زمانوں سے ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعلق نہیں رہا۔

کانگریس نے ۱۸۸۵ء میں جنم لیا۔ اور ۱۹۲۱ء تک اس کی جدوجہد اپیلوں درخواستوں اور یادداشتوں کے پیش کرنے سے آگے نہ بڑھ سکی لیکن ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے خلاف جو ایجی ٹیشن شروع ہوا، اس نے ایک عوامی لڑائی کی شکل اختیار کرلی، جسے اُس وقت کی کانگریس کے دستوری چوکھٹے میں جکڑنا مشکل تھا۔ سچ پوچھئے تو عوام کی یہی لڑائی کانگریس کو ایک نئی راہ پر ڈالنے کا سبب بنی۔ اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس کے دستوری ایجی ٹیشن کے دور میں بھی راج نارائن بوس کی جانب سے ہندو قومیت اور سرسید احمد خاں کی طرف سے مسلم قومیت کے گمراہ کُن نظریہ کے پرچار کے باوجود، پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان دونوں ہی کانگریس سے وابستہ رہے۔

بدرالدین طیب جی اور رحمت اللہ سایانی جیسے مسلم دانشوروں نے کانگریس کی مسندصدارت سنبھالی تو شبلی نعمانی جیسے عالم نے مخالفت کے باوجود کانگریس کی تائید کو اپنا شعار بنائے رکھا بدرالدین طیب جی کو جنہوں نے کانگریس کے تیسرے سالانہ اجلاس کی صدارت کی انجمن اسلام نے کانگریس میں اپنا ڈیلی گیٹ منتخب کیا تھا۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہندستان کے

دونوں اہم فرقوں میں سے کوئی بھی کانگریس سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ کانگریس کے بارھویں سالانہ اجلاس کے صدر رحمت اللہ سایانی نے کانگریس میں شمولیت کے مخالف انگریز دوست مسلمانوں کو اپنے ۱۷ نکاتی پروگرام کے ذریعہ لاجواب کردیا۔ ایک متمول مسلمان ہمایوں کرار اس پرآشوب دور میں جب کہ کانگریس کی زبانی ہمدردی بھی برطانوی سامراج کے عتاب کا ہدف بنا سکتی تھی، مدراس میں کانگریس کے اجلاس کے انعقاد کے لئے ۵ ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا۔ بمبئی کے ایک سرکردہ مسلم تاجر علی محمد بھیم جی نے گاؤں گاؤں میں کانگریس کا پیام پہونچانے کے لئے اپنے آپ کو بالکلیہ وقف کردیا تھا۔

مسلم دانشوروں میں صرف مولانا شبلی ہی نہیں بلکہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ملا محمد سراجی جیسے کتنے ہی علماء کانگریس کے پرچم تلے جنگ آزادی میں شامل ہوگئے۔ تقسیم بنگال کے مرحلہ پر کانگریس کے دستوری پر کھٹے کو ٹوٹتا دیکھ کر برطانوی سامراج اور اس کے حواریوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ انھوں نے ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ کو اپنا آلۂ کار بنا کر اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کو کانگریس کے دائرہ اثر سے باہر نکالیں۔ سلیم اللہ نے اپنے انگریز سرپرستوں کی ایماء پر ہندستان کے مختلف مقامات کے دورے شروع کئے اور ان ہی کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کومیلا میں (جو بنگلہ دیش کا ایک مشہور شہر ہے) فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضاء پیدا ہوگئی، لیکن ایک دو ناخوشگوار واقعات کے سواء کوئی بڑا سانحہ نہیں ہوا اور بنگال کے کئی سرکردہ مسلمانوں نے مخالف تقسیم بنگال مہم میں جوش وخروش سے حصہ لیا۔ یہاں تک کہ ڈھاکہ ہی کے ایک نواب عتیق اللہ نے جو، سلیم اللہ کے رشتہ دار تھے، واضح اعلان کیا کہ مشرقی بنگال کے مسلمان، تقسیم بنگال کے حامی نہیں ہیں۔

مخالف تقسیم بنگال تحریک کی عوامی نوعیت، پہلی جنگ عظیم اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے ہندستان کی جنگ آزادی کو ایک نئے موڑ پر پہونچا دیا۔ گاندھی جی اور علی برادران کی قیادت نے اس میں تیزی پیدا کردی اور بے شمار مسلمانوں نے آزادی کی اس لڑائی میں حصہ لیا انھیں قید صعوبت وبندگی کے علاوہ جسمانی اور روحانی اذیت بھی برداشت کرنی پڑی۔ بنگال سے مولانا آزاد

مولانا اکرم خاں، اسمٰعیل سراجی غیاث الدین احمد اور مولوی بقادی چاند میاں، اشرف الدین احمد جیسی شخصیتیں اٹھیں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر عالم نے لاہور میں آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ حسرت موہانی نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ وطن عزیز کے لئے چکی کی مشقت گوارا کرلی۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ سے عبدالغفار خاں نے برطانوی سامراج کو للکارا۔ حکیم اجمل خاں، تصدق احمد خاں شروانی، مولانا ظفر علی خاں، اور جناب عبدالرحمٰن ایڈیٹر الامین (کاکی کٹ) حریت پسندوں کے اس کارروان میں شریک ہو گئے اور اسی قافلہ کے نوعمر اور نوخیز مسافروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا رول قدرے مختلف، اور بدلا ہوا سا ہے۔

شرافت نفس کی پہلی فتح

جنگ آزادی کے اس طوفانی دور میں ذاکر صاحب کے لئے یہ بات آسان تھی کہ وہ رزم گاہ کے اس حصہ کا رُخ کرتے جو سبھوں کا مرکز نظر بنا ہوا تھا۔ اس حصہ پر بھی دار ورسن کے سایے رقصاں ضرور تھے لیکن اسی گروہ سرفروشاں سے وابستگی عنان قیادت کا حقدار بھی گردانتی تھی۔ ذاکر صاحب کے خمیر و مزاج کے تجزیہ کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ انہوں نے قیادت و رہنمائی کے راستہ کی بجائے جامعہ ملیہ کے گوشہ کو کیوں اپنایا۔ ان کے شعور و احساس کی نئی منزل ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتی ہے جب کہ گاندھی جی کی اپیل پر ملک کے نوجوان درس گاہوں کے دروازے بند کر کے عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہونے لگے تھے۔ ذاکر صاحب ان دنوں سرسید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے ذہین طالب علم تھے۔ گاندھی جی کے افکار نو سے اس نوجوان کا ذہن پہلے ہی سے بہک رہا تھا کہ اس عالم میں درس گاہوں کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوئی۔ ذاکر صاحب کی زندگی کا یہ باب بہت دلچسپ ہے۔

۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون کا آغاز کیا اور اکتوبر ۱۹۲۰ء تک اس کی صدائے بازگشت علی گڈھ پہونچ گئی۔ یہ وہ دور ہے، جب کہ گاندھی جی کی

زیر قیادت خلافت تحریک بھی چلائی جا رہی تھی ۔ اور علی برادران اس میں نمایاں حصہ لے رہے تھے پہلی عالمگیر جنگ کے موقع پر برطانوی حکمرانوں نے ہندستان کے تعلق سے جو وعدے کئے تھے، ان کا بھرم کھل گیا تھا اور ۱۹۱۹ء کے "ماونٹ فورڈ اصلاحات" نے ہمارے ملک میں مایوسی کی ایک لہر پیدا کر دی تھی "جلیان والے باغ کے المیہ کا زخم انگریزیہ کے کرم ہائے بیشمار" میں ایک نئے شگوفہ سے کم نہ تھا۔ اس پس منظر میں عدم تعاون کا نعرہ مرہم کی شکل اختیار کر گیا۔ اور اس نے کتنے ہی ہندستانیوں کی زندگی کو ایک انقلاب سے دوچار کر دیا ــــ ذاکر صاحب کو جو اپنی ذکاوت و فراست، تبحرّ علمی کی بنا و پر ایم اے او کالج کے تشنگانِ علم کے لئے مرشد بن گئے تھے۔ گاندھی جی کے منحنی جسم میں وہ روح نظر آنے لگی جو سورج کی ناچتی کرنوں کی طرح ہر قید سے آزاد ہوتی ہے۔

اسی سال ستمبر میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اور اس اجلاس میں گاندھی جی کے عدم تعاون و عدم تشدد کے فلسفہ کو قبول کرتے ہوئے محبانِ آزادی نے اپنے ہموطنوں کو آواز دی کہ وہ برطانوی سامراج کے القاب و خطابات واپس کر دیں ۔ طلبار کو للکارا کہ وہ تعلیمی اداروں سے باہر نکل آئیں۔ ججوں سے درخواست کی کہ وہ نا انصافی پر مبنی برطانوی تسلط کا جواز پیدا کرنے والے عدلیہ سے اپنا رشتہ توڑ لیں ۔ مزدوروں کو صفِ اعدا کے مقابل ڈٹ جانے کی صلاح دی گئی ۔ کسانوں سے کہا گیا کہ وہ مالگذاری ادا نہ کریں، اس درد مندانہ اپیل نے برطانوی سامراج کی چولیں ہلا دیں ۔ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی عیسائی سب کہا اپنے جنم سدھ ادھیکار (پیدائشی حق) سوراج کے لئے ایک ایسی لڑائی میں شامل ہونے لگے جس میں سچائی صداقت، اور بے باکی کے سوا کسی اور ہتھیار کے استعمال کی اجازت نہ تھی۔

دوکانوں میں دھرے ہوئے برطانوی ملوں کے تیار کردہ بیش قیمت کپڑوں کے انبار فروزاں ہو گئے ۔ عورتیں اور لڑکیاں بھی برطانوی سنگینوں کا لحاظ کئے بغیر بائیکاٹ

کی اس تحریک میں کود پڑیں۔ اور انگریزوں کو اس دبلے پتلے سے آدمی کی اخلاقی قوت، اور گاندھی کا پہلی مرتبہ اندازہ ہوا۔ جسے بڑی حقارت کے ساتھ فقیر سنیاسی اور سادھو کا نام دیا جاتا تھا۔ جس ملک کو انھوں نے سانپوں، اور سپیروں کی نگری سمجھ رکھا تھا، وہ ایک آتش فشاں کی طرح لاوا اگلنے لگا۔

ایم ۔اے ۔او کالج کے ارباب مجاز جنہوں نے برٹش سرکار کے سایۂ عاطفت میں شعور سنبھالا تھا، اور جن کے نزدیک، حکمران طبقہ کی تہذیب ہی شائستگی اور اخلاق کی سب سے بڑی پہچان تھی اس صورت حال سے سراسیمہ ہو گئے، لیکن کرتے بھی کیا۔! جو آگ، چاروں طرف سے بڑھتی ہی چلی آرہی تھی، اسے فرو کرنا، ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی درس گاہ کے طلباء کی ایک ٹولی نے، علی برادران، اور گاندھی جی سے ملکر ان سے خواہش کی وہ علیگڈھ آئیں، جو تحریک عدم تعاون کا سب سے بڑا مرکز بن سکتا تھا۔ نوجوانوں کے اس وفد نے علی گڑھ کا بڑا امید افزا خاکہ بھی پیش کیا۔ اور ان کی کامیاب وکالت کے نتیجہ میں علی برادران، اور گاندھی جی نے نہ صرف علی گڈھ آنے کا وعدہ ہی کرلیا، بلکہ اپنے دورہ کی تاریخ بھی مقرر کردی۔ اتفاقاً ان دنوں ذاکر صاحب علیل تھے وہ چاہتے تھے کہ اس وقت کے مشہور معالج ڈاکٹر انصاری سے اپنا طبی معائنہ کرالیں، چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر انصاری سے ربط پیدا کیا، اور ڈاکٹر صاحب نے ان کے معائنہ کے لیئے وہی تاریخ مقرر کی، جو گاندھی جی، اور علی برادران کے دورۂ علی گڑھ کے لیئے طے پا چکی تھی ذاکر صاحب کو بادل نخواستہ، عین اسی دن علیگڈھ سے دہلی روانہ ہونا پڑا۔ طبی معائنہ اور مشورہ کے بعد وہ دہلی سے علی گڑھ واپس ہوئے اور ریلوے پلیٹ فارم پر ہی انھیں اپنے کئی ساتھی ملے، جو، گاندھی جی، اور علی برادران پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "آئے بھی وہ گئے بھی، ختم فسانہ ہوگیا۔" اور یہ ایک حقیقت تھی کہ گاندھی جی، اور علی برادران، ایم۔اے۔او۔کالج سے مایوس لوٹے تھے۔ انہوں نے اسٹوڈنٹس یونین کے ایک جلسہ میں شریک ہوکر بائیکاٹ، مقاطعہ اور عدم تعاون کا پیام سنایا۔ لیکن سننے والوں کے کانوں

پہر جوں تک نہ رینگی۔

توقع کے مطابق اس واقعہ نے بیمار ذاکر صاحب پر بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ انھیں حیرت تھی کہ اس واقعہ پر ان کے ساتھی ملول ہونے کے بجائے مسرت کا اظہار کیوں، اور کیسے کر رہے ہیں۔ ان کے اصرار پر دوسرے دن بھی اسٹوڈنٹس یونین کا اجلاس منعقد ہوا اور اس اجلاس کے شرکا میں ذاکر صاحب بھی موجود تھے سخت بخار میں مبتلا، تمتمایا ہوا چہرہ لڑکھڑاتے ہوئے دست و بازو، جلسہ جاری ہی تھا کہ علی برادران نمودار ہوئے۔ اور پھر ان کی آواز گونجنے لگی۔

"علی گڈھ کو ہم اپنا روحانی مرکز سمجھتے
رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ
بڑی توقعات لے کر یہاں آئے تھے
مگر انتہائی مایوسی کے عالم میں
واپس ہو رہے ہیں ——"

اس مختصر سی اثر آفریں تقریر نے محفل کا رنگ بدل دیا اور پھر یکے بعد دیگرے کئی لوگوں نے تقاریر کیں۔ ہر تقریر میں اس بات پر زور دیا گیا کہ علی گڈھ کے طلباء کو بھی تحریک عدم تعاون میں حصہ لینا چاہیئے۔ ابن حسن ایک کونہ میں بیٹھے اپنے ساتھیوں کی تقاریر سن رہے تھے۔ اچانک وہ بھی کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا میں بھی آپ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اس معاملہ کو صرف کالج کے مقاطعہ اور بائیکاٹ ہی پر ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ حصول علم کی متبادل سہولتیں کے بغیر ہمارے لئے یہ فیصلہ مضرت رساں ہوگا اس لئے جو لوگ ہمیں کالج چھوڑنے کی صلاح دے رہے ہیں۔ ان پر متبادل تعلیمی سہولتیں بہم پہونچانے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔

کانگریس کے خصوصی اجلاس کی منظورہ قرارداد میں بھی اس بات کا اشارہ تھا۔ اس لئے ابن حسن نے کوئی غلط استدلال پیش نہیں کیا۔ لیکن جوان سال محبان وطن کو ابن حسن کی یہ صلاح

پسند آئی، ان کے لیے تو بائیکاٹ اور مقاطعہ میں بڑی کشش تھی۔ نتیجتاً ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور ابن حسن پر الزام لگایا جانے لگا کہ وہ چونکہ طالب علم ہی نہیں، بلکہ جز وقتی لیکچرار بھی ہیں اس لیے انھیں یہ بات منظور نہیں کہ ہر ماہ ملنے والے معاوضہ سے دستبردار ہو جائیں۔ ذاکر صاحب بھی جز وقتی لیکچرار تھے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی تقاریر سنتے رہے۔ ابن حسن کی بات انھیں پسند آئی لیکن وہ سوچ رہے تھے کہ اس جذباتی منزل پر ابن حسن کی تائید سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ انھیں بھی جز وقتی لکچرار کی تنخواہ عزیز ہے۔ دوسری طرف اخلاقی جراءت کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ حرف زنی تنقید اور تنقیص کا لحاظ کیے بغیر کھری کھری سنائیں۔ گو مگو اور کشمکش کے اس لمحے میں ذاکر صاحب کے اندر کے شریف اور راسخ القول آدمی نے انھیں سہارا دیا۔ اور وہ ابن حسن کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے مگر جذبات کی رو میں بہنے والی جوانیوں کو اصابت فکر اور ذہنی دیانت داری کا یہ مظاہرہ پسند نہ آیا۔ چنانچہ ان کے ایک مخلص دوست سید محمد نے کافی بلند آواز میں کہا "میں اس آدمی کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ یہ نیک شریف اور ایماندار ضرور تھا لیکن اپنے ذاتی مفاد نے اسے اندھا کر دیا ہے اب اس کا کوئی کردار نہیں رہا۔ ساتھیو! اس کی بات پر کان نہ دھرو"۔ ذاکر صاحب کی شرافت نفس کو جلال آگیا ان کا چہرہ غصہ سے لال ہو چلا تھا لیکن اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آپ کے شکوک، وشبہات کے ازالہ کے لیے میں سب سے پہلے استعفیٰ دینے تیار ہوں۔ ابن حسن نے بھی ان کے فوراً بعد ہی استعفیٰ کا پیش کش کیا۔ اور چڑھی ہوئی تیوریاں اتر گئیں۔ جلسہ گاہ میں ذاکر زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے۔ بڑے سوچ بچار کے بعد ایک قرار داد منظور کی گئی جس میں کالج کے ارباب مجاز سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ سرکار کی نگرانی اور امداد سے تخلص حاصل کریں۔ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر کالج کے ارباب مجاز اس مطالبہ کو تسلیم نہ کریں تو قومی قایدین کا فرض ہوگا کہ وہ علی گڑھ چھوڑنے والے طلبار کے لیے تعلیم کی متبادل سہولتیں بہم پہونچائیں۔

ذاکر صاحب کی شرافت نفس کی یہ پہلی فتح جامعہ ملیہ کے قیام کا نقطہ آغاز تھی، جو

بنیادی طور پر مسلم تعلیمی ادارہ تھا لیکن جس کی جڑیں ہندستانی قومیت میں پیوست تھیں۔ اسٹوڈنٹس یونین کے جلسہ میں منظورہ اس قرارداد کی کاپیاں گاندھی جی، علی برادران، ڈاکٹر ایم اے انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا حسرت موہانی کو بھجوائی گئیں۔ کچھ دنوں بعد ذاکر صاحب کی قیادت میں طلباء کے ایک وفد نے مولانا محمد علی سے ملاقات کی۔ اور انھیں بتایا کہ علی گڑھ کے طلبا کالج چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ بشرطیکہ ان کیلئے متبادل تعلیمی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔ حکیم اجمل خاں نے طلباء کے وفد کے اس مطالبہ سے اتفاق کیا اور انھیں ہدایت کی کہ وہ گاندھی جی سے ملاقات کریں۔ گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری کے کہنے سننے پر علی برادران نے علی گڑھ کے طلباء کو متبادل سہولتیں بہم پہونچانے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا۔ ذاکر صاحب کی کالج بیزارگی میں اضافہ ہوتا رہا وہ تو فوراً کالج چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن اور خیال میں ایک ایسے تعلیمی ادارہ کا تصور جاگزیں تھا جو برطانوی تسلط و کنٹرول سے آزاد ہو۔ ہندستان کی نئی نسل کو ایسی تعلیم دے جو ان کے جذبۂ وطن دوستی کو جلا دے سکے۔ ذاکر صاحب کی اس کالج بیزارگی میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین کا بھی بڑا دخل تھا۔ ذاکر صاحب کے قریبی دوست پروفیسر محبیب کے الفاظ میں ذاکر صاحب، ہر اس بات کی خلاف ورزی کو اپنا اولین فریضہ تصور کرتے تھے، جو ڈاکٹر ضیاءالدین کو پسند ہوتی۔ پرنسپل صاحب کو اپنے شاگرد کی تضاد طبع کا علم ہونا چاہیے تھا لیکن حالات کو بگڑتا دیکھ کر وہ بوکھلا گئے اور انھوں نے ایک دن ذاکر صاحب کو بلا کر بڑی محبت اور شفقت سے یہ سمجھانے کی کوشش کی وہ کالج چھوڑنے کا خیال ترک کردیں۔ ان سے یہ حماقت بھی سرزد ہوئی کہ انھوں نے ذاکر صاحب کو یقین دلایا کہ ایک سال بعد جب وہ ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرلیںگے تو ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر ان کے تقرر کی کوشش کی جائیگی

غیور اور خود دار طالب علم کے لیے ناعاقبت اندیش پرنسپل کی یہ تحریص آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کر گئی اور ذاکر صاحب نے اپنی سرگرمیوں میں تیزی پیدا کردی۔ ان کے ساتھی بڑی تعداد میں کالج چھوڑنے لگے اور ایم اے او کالج کے احاطہ ہی میں ۳۰۰ طلباء کے ایک ہراول دستہ نے متبادل تعلیمی ادارہ کے قیام کا تہیہ کرلیا۔ ارباب مجاز نے ان سرپھروں سے

خلاصی حاصل کرنے بہتیرے جتن کئے لیکن ان کی ایک نہ چلی ، قومی قیادت اس مسئلہ پر دو گروہوں میں بٹ گئی تھی ایک گروہ چاہتا تھا کہ علی گڈھ کالج سے ہٹ کر ایک دوسرا ادارہ قائم کیا جائے لیکن دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ علی گڈھ کالج ہی پر قبضہ کرلینا چاہیئے۔ بعضوں نے تو یہ بھی کہا کہ اگر طلبا کو زبردستی کالج کے احاطہ سے نکلنے کی کوشش کی جائے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔ حکیم اجمل خاں علی گڈھ کالج سے ہٹ کر ایک دوسرے تعلیمی ادارہ کے قیام کے حامی تھے لیکن مولانا محمد علی چاہتے تھے کہ علی گڈھ کالج ہی کو قومی درس گاہ میں تبدیل کر دیا جائے چنانچہ جامعہ کی تاسیس کے دن بھی مولانا نے کہا کہ جامعہ ملیہ کو علی گڈھ پر حملہ کی تیاری کا مرکز سمجھنا چاہیئے کافی بحث و مباحثہ کے بعد بالآخر ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا۔

علی گڈھ کالج کے اس تاریخی اجتماع کو ہماری جنگ آزادی کی تاریخ میں ایک نئے سنگ میل کا نام دیا جانا چاہیئے، جس میں ہندستان کی اس پہلی قومی درس گاہ کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا گیا رسم افتتاح شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے انجام دی وہ ان دنوں علیل تھے۔ اس لئے ان کا تحریر کردہ خطبہ صدارت مولانا بشیر احمد عثمانی نے پڑھا۔ اور اجتماع میں حکیم اجمل خاں کو امیر جامعہ (چانسلر) اور مولانا محمد علی کو پہلا شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مقرر کیا گیا۔ ارکان انتظامی میں جناب لطیف الرحمٰن کے پہلے نام کے بعد ہی ذاکر صاحب کا نام تھا۔ اس نئی صورت حال نے علی گڈھ کالج کے ارباب مجاز کو بھی مخالفانہ سمت میں متحرک کر دیا۔ اور ایک دن فجر کی نماز کے فوراً بعد ہی طلباء نے دیکھا کہ پولیس نے کالج کا محاصرہ کر رکھا ہے ایک پولیس افسر نے آگے بڑھ کر ایک حکمنامہ مولانا محمد علی کے حوالے کیا جس کے ذریعہ انھیں ہدایت دی گئی تھی کہ وہ طلباء کے ساتھ فوراً کالج کے احاطہ سے باہر نکل جائیں۔ مولانا، اور ان کے شاگردوں نے جس انداز میں اس حکمنامہ کی تعمیل کی اس کی تفصیل آج تک بھی ہمارے دلوں کو گرماتی ہے۔ آگے آگے مولانا چل رہے تھے اور ان کے پیچھے سرفروشانِ وطن کا قافلہ، کون جانتا تھا کہ اس قافلہ میں ایک ایسی شخصیت بھی شامل ہے جو آزاد ہندستان کے مسندِ صدارت پر فائز ہوگی۔ حکیم اجمل خاں کو غالباً اس بات کا اندازہ ہو چلا تھا کہ جلد یا بدیر یہ دن ضرور آئیگا، چنانچہ انھوں نے کالج

کے باہر ایک میدان میں چند خیمے نصب کر رکھے تھے۔ مولانا محمد علی کی زیر قیادت طلبا کا جلوس اس میدان کی طرف چل پڑا اور پھر جامعہ ملیہ نے انھیں خیموں میں باقاعدگی سے کام شروع کر دیا ذاکر صاحب معاشیات کے استاد مقرر کیے گئے۔ خواجہ عبدالحمید کیمیا کے درس دینے لگے رؤف پاشا نے عربی کا شعبہ سنبھال لیا۔ سید نوراللہ انگریزی پڑھانے لگے اور سید محمد شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے نگراں مقرر کیے گئے۔ اس جرأت رندانہ نے علی گڑھ کالج کے بعض اساتذہ کی غیرت قومی کو بھی للکارا۔ اور وہ بھی جامعہ ملیہ کے لیے کچھ وقت دینے لگے علی گڑھ کے علاوہ ہندستان کے دور دراز شہروں میں رہنے والے بعض دانشوروں نے بھی اس مثالی اور منفرد جامعہ کے لیے اپنی خدمات کا پیش کش کیا۔

علی گڑھ کے اس تجربہ نے ملک کے دوسرے حصوں پر بھی گہرا اثر چھوڑا چنانچہ جامعہ ملیہ کے قیام کے چار مہینے کے اندر ہی علی گڑھ کی نیشنل مسلم یونیورسٹی گجرات ودیا پیٹھ، بہار ودیا پیٹھ، کاشی ودیا پیٹھ، بنگال نیشنل یونیورسٹی اور تلک مہاراشٹرا ودیا پیٹھ کا قیام عمل میں آیا ہزاروں طلبا برطانوی سرکار کے قائم کردہ کالجوں سے رشتہ توڑ کر ان قومی درسگاہوں میں شریک ہو گئے۔ جہاں تک جامعہ ملیہ کا تعلق تھا اس کے اخراجات کی تکمیل کے لیے خلافت کمیٹی نے ماہانہ دس ہزار روپے کے فراہمی کی ذمہ داری قبول کر لی اور خیموں کے علاوہ اس رقم سے چند مکانات بھی کرایے پر حاصل کر لیے گئے۔ خواجہ عبدالحمید کافی خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ایک کافی بڑی کوٹھی میں رہتے تھے اس کے بعض کمرے انہوں نے جامعہ کے اساتذہ کے قیام کے لیے وقف کر دیے۔ انھیں جامعہ کے لیے کیمسٹری کی ایک لیباریٹری کے قیام کا مجاز گردانا گیا اور اس کے لیے بیس ہزار روپے بھی فراہم کیے گئے۔ اب جامعہ شباب پر آگئی تھی اور خود مولانا محمد علی بھی بعض کلاسیں لیا کرتے تھے تاسیس جامعہ کے موقع پر جو ۲۷ رکنی فاونڈیشن کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا اور اس کے اجلاس میں عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ مروجہ نصاب ہی کو ضروری اور فروعی تبدیلیوں کے ساتھ باقی و برقرار رکھا جائے اسی اجلاس میں

ہندو طلباء کے داخلہ کے امکانات بھی پیدا کر دیئے۔

گاندھی جی بھی فاونڈیشن کمیٹی کے اس اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم طلبار کی طرح ہندو طلبار کی خصوصی تعلیم کا بندوبست بھی اس شرط کے ساتھ کیا جانا چاہیئے کہ خود ہندو طلباء کے سرپرست موزوں استاد کی تنخواہ اور دیگر اخراجات کا بار برداشت کریں۔ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کے لئے فاونڈیشن کمیٹی نے ایک خصوصی پینل مقرر کیا جو مسٹر جواہر لال نہرو، ڈاکٹر محمد اقبال مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر انصاری مولانا محمد علی سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کے پرنسپل ایس کے رودرا، اور ڈاکٹر راجندر پرشاد پر مشتمل تھا۔

جامعہ ملیہ سے پہلے

جامعہ ملیہ کے قیام کی اہمیت کا اندازہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہندستان میں قومی تعلیمی اداروں کی تاریخ اور ایم اے او کالج کے عالم وجود میں آنے کے پس منظر کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ ذاکر صاحب جو جامعہ ملیہ کے روح رواں رہے ایم اے او کالج ہی کی دین تھے۔ لیکن ایم اے او کالج سے جامعہ ملیہ تک قومی نقطۂ نظر کو ارتقا کے مختلف مرحلوں سے گذرنا پڑا ہے۔ اور ذاکر صاحب کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کے لئے ان مراحل کا جائزہ لینا ضروری ہوجاتا ہے۔ مسلم تعلیمی اداروں کے قیام کی تاریخ ۱۸۶۰ء کے اوائل سے شروع ہوتی ہے جبکہ بنگال میں جو ہندستانی قومیت کا بہت بڑا گہوارہ رہا ہے نیشنل مسلم ایسوسی ایشن اور محمڈن لیٹریری سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ان دونوں اداروں کے بانی اپنے زمانے کے مشہور ادیب عبداللطیف تھے۔ ان کا مغربی تعلیم یافتہ بنگالی زمینداروں سے قریبی ربط وضبط تھا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ۱۸۶۰ء میں ان اداروں کے قیام سے پہلے ہندستان کے مسلم دانشور مغربی تعلیم اور انگریزی زبان وادب سے بالکل ناآشنا اور بے بہرہ تھے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلم جاگیرداروں کا تعلیم یافتہ طبقہ یوروپی نظام تعلیم کو پسند نہیں کرتا تھا۔

وہ مادری زبانوں میں تعلیم کا حامی تھا۔ لیکن، اسی طبقہ کے بعض افراد نے اپنے بچوں کو برٹش دہلی کالج، اور بنگال کے فورٹ ولیم کالج میں داخل کیا تھا۔ تاریخ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں کالجوں میں نیچرل سائنس کی تعلیم کا نہایت معقول اور مناسب انتظام تھا۔ دہلی کالج میں تو بعض ایسی شخصیتوں نے بھی تعلیم پائی جن کا شمار ہندستان کے سرکردہ صوفیوں میں کیا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعض قائدین بھی دہلی کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔ اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران دہلی کالج بند کر دیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ان دونوں، درس گاہوں کے فارغ التحصیل مسلم دانشوروں کے ایک گروہ کی موجودگی کے تعلق سے تاریخی شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان مغربی تعلیم یافتہ مسلم دانشوروں کا عام مسلمانوں پر بہت کم اثر تھا۔ اور جاگیردار گھرانوں میں بھی ملاؤں اور عالموں ہی کی عزت و توقیر ہوا کرتی تھی۔ مواضعات میں ان ہی عالموں، اور ملاؤں کے نیم جاہل نمائندہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے علمبردار، اور محافظ تصور کیے جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے تعلق سے برطانوی حکمرانوں کا بے حد سخت رویہ، اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں ان کے داخلہ پر پابندی اور سرکاری ملازمتوں سے ان کی محرومی نے ان کے تعلیمی اور تہذیبی ارتقاء کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیں، اور ان ہی دشواریوں پر قابو پانے کے لیے مسلم تعلیمی اداروں کے قیام پر توجہ دی جانے لگی۔ یہ ادارے مسلمانوں میں وسیع النظری تو پیدا نہ کر سکے لیکن ان کے فارغ التحصیل طلباء کی جانب سے بعض انگریزی کتابوں کے بنگالی اور اردو میں ترجمے اور ان کی اشاعت کے علاوہ اہم معاشرتی امور پر مباحث و مذاکرات نے علم و دانش کے ارتقاء کے لیے سازگار فضاء پیدا کر دی۔ مسلم تعلیم یافتہ گروہ نے موافق برطانیہ رجحان کی مخالفت کیے بغیر، قدامت پسندی اور روایت پرستی پر ہلکی سی ضربیں لگانی شروع کیں۔ لیکن ان اداروں کی فرقہ وارانہ نوعیت نے، ان کی افادیت کو بھی جلد ہی ختم کر دیا۔ نیشنل مسلم ایسوسی ایشن نے دانشوروں کے مابین، ہندو اور مسلمان

کی حد فاصل قائم کر دی۔ اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی کل ہند ادارہ سے وابستہ نہ رکھیں۔ بنگال کے علاوہ ہندستان کے دیگر علاقوں میں بھی جو مسلم تعلیمی ادارے قائم ہوئے، ان کا رول بھی کم و بیش یہی رہا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سر سید احمد خاں ان ہی مسلم تعلیمی اداروں کی دین ہیں۔ سر سید ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے، اور انھوں نے ۱۸۹۸ء میں وفات پائی۔ انھوں نے پہلی جنگ آزادی کے بعد صبر آزما دور میں ہندستانی مسلمانوں کو حالات سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی نئی راہ دکھائی۔ لیکن تاریخ نے انھیں ایک نزاعی شخصیت بنا دیا ہے۔ چنانچہ ان کے تعلق سے مختلف اور متضاد خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایک گروہ کی رائے میں وہ ہندو مسلم کے فرق و امتیاز کے بانی ہیں۔ لیکن ایک دوسرا گروہ جس میں ہمارے ملک کی جنگ آزادی کے سرکردہ اور سربرآوردہ رہنما بھی شامل ہیں انھیں عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ جہاں لارڈ ٹاوی نوآبادیاتی نظام کے خیر خواہوں کے لئے سر سید خاصہ کی چیز بن گئے وہیں روشن خیال اور ترقی پسند حلقوں میں انھیں اس لحاظ سے اعلیٰ مقام دیا گیا کہ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کو روایات و اوہام کے تاریک غار سے نکالا۔

سچ تو یہ ہے کہ سر سید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے کارنامے بھی مختلف اور متضاد پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور اسی لئے ضروری یہ ہے کہ اس عہد ساز مفکر کا بحد احتیاط سے جائزہ لیا جائے۔ سر سید انیسویں صدی عیسوی کے دہلی کے ایک مسلم جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر کی تشکیل پہ ان کے والد کے افکار اور خیالات کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے مسلم ریفارمر ولی اللہ شاہ کی تعلیمات اور خاص طور پر ان کے سماجی انصاف کے نظریہ سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ کچھ عرصہ تک تو سر سید کو شاہ ولی اللہ کے شاگرد خاص شاہ محمد اسمٰعیل کی قربت اور ہم نشینی کا شرف بھی حاصل رہا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد سر سید احمد خاں کے انداز فکر میں تبدیلی واقع ہوئی اور وہ اپنے گذرے ہوئے عہد کو ایک "نظر فریب" خواب کا

نام دینے لگے آثار الصنادید کی تکمیل و اشاعت کی منزل تک سرسید احمد خاں شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات پر کاربند تھے۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے مغل شہنشاہیت کے زوال کے جو اسباب بیان کئے ہیں وہ شاہ ولی اللہ کے نظریہ سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کو وہ نیچر (فطرت) کے عین مطابق تصور کرتے ہیں۔ ولفریڈ سمتھ نے اپنی کتاب ماڈرن اسلام ان انڈیا (مطبوعہ ۱۹۴۳ء) میں سرسید کے بارے میں لکھا ہے

> "سرسید اسلام کو ارتقاء کا سرچشمہ سمجھتے تھے اور اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے اس کا مطالعہ بھی کیا تھا وہ چاہتے تھے کہ ہندستان کی عصری ضروریات پر اسلامی اصولوں کا اطلاق کریں اور اس میں انیسویں صدی کی برطانوی تہذیب کو سمونے کی گنجائش بھی نکل آئے۔ نئے علوم و فنون وسیع النظری اور سائنسی معقولیت پسندی کو اسلامی تعلقات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے"

اسی ذہن سے انہوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کا ذوق پیدا کیا وہ چاہتے تھے کہ مسلمان یوروپی تہذیب و تمدن کے نگارخانے سے اپنے آپ کو الگ تھلگ نہ رکھیں اسے اچھی طرح پرکھ لیں کہ اس کے علمی اقدار کو اپنانے میں انھیں کوئی تامل نہ ہو۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے خود اپنے ہموطنوں اور مغربی ممالک کے ہمدردوں کے عطیوں اور چندوں سے ۱۸۷۳ء میں علی گڈھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جس نے بعد میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلی۔ سرسید کی مساعی، جسے

علی گڈھ تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔ اپنے مذہبی اور فرقہ وارانہ رنگ کے باوجود مسلمانوں کو کٹھ ملاؤں کے شکنجے سے نجات دلانے کا سبب بنی اور غائر نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ تحریک جاگیرداری کی گرفت کو کمزور کرنے کا سبب بنی۔ لیکن سرسیّد کے علاوہ جتنے اکابر اس تحریک سے وابستہ ہوئے ان کے سماجی اور سیاسی نقاط نظر میں ایک قسم کا تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ برطانوی حکمرانوں کے جور و استبداد اور ان کی لوٹ کھسوٹ سے نالاں تھے اور انھیں انحطاط پذیر جاگیردارانہ سماج سے بھی لفت سی ہو چلی تھی جو نئی اقدار کو جنم دینے کی اہلیت سے محروم ہو چکا تھا تو دوسری طرف وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے برطانوی حکمرانوں کی مخالفت نہیں بلکہ موافقت مفید ثابت ہوگی۔ سرسید احمد خاں بھی اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے برطانوی سامراج کی سرپرستی کو ناگزیر تصور کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ شعوری طور پر وہ تاج برطانیہ کے وفادار بنے رہے ان کے نزدیک سماجی اصلاحات اور برطانوی حکمرانوں سے جذبہ وفاداری لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ برطانوی سامراج کو ان کے اس اندازِ فکر سے فائدہ اٹھانا چاہیئے تھا اور اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ سرسیّد نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ ان کے مسلم کالج کا ایک بڑا مقصد ہندستانی مسلمانوں کو تاج برطانیہ کا وفادار بنانا ہے۔

اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں سرسید ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور علمبردار تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ ہندو اور مسلمان مل جل کر ہی ملک کو درپیش مسائل کا کوئی حل نکال سکتے ہیں۔ ۱۸۸۴ء میں انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا

"ہندو اور مسلمان کی اصطلاحیں
گو مذاہب کی نمائندگی ضرور کرتی ہیں
لیکن ہندو مسلمان سکھ عیسائی جو
بھی اس ملک میں رہتا ہے وہ ایک

ہی قوم سے وابستہ ہے اور اس
خصوص میں مذہبی عقائد کے اختلاف
کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
چونکہ ہم سب ایک قوم
کے ارکان ہیں اس لئے ہم سبھوں
کے سیاسی مفادات ایک ہی نوعیت
کے ہیں ہمیں اپنے مشترکہ مسائل
کی یکجوئی کے لئے متحد رہنا
چاہیئے ۔ کیونکہ صرف اسی طرح ہم
باقی رہ سکتے ہیں ۔ دوسری صورت
ہمارے لئے تباہ کن ہوگی ۔ "

۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قیام کے بعد سرسید کے اس اندازِ فکر میں تبدیلی واقع ہوئی اور وہ برطانوی حکمرانوں کی وفاداری کے جوش میں کانگریس کو سو فیصد ہندو تنظیم قرار دینے لگے ۔ " دی یورسیس آف انڈین ٹریڈیشن " کے مصنف ولیم تھیوڈور ڈی بیری کے مطابق کانگریس کے تعلق سے سرسید احمد خاں نے جو رویہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ

" انڈین نیشنل کانگریس کے اغراض و
مقاصد کے تعین کے سلسلے میں
ایک بڑی غلطی روا رکھی گئی
ہے اور وہ یہ ہے کہ کانگریس
کے بانیوں نے ہندستان میں رہنے
بسنے والی لاتعداد قومیتوں کو ایک ہی

قوم سمجھ لیا ہے ان کا خیال ہے کہ مسلمان، مرہٹے، برہمن
کھتری، بنیئے، شودر، سکھ، بنگالی، مدراسی اور پشاوری
سب ہی پر ہندستانی قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ کانگریس
اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ مسلمانوں کے
جذبات، خیالات اور ان کی امنگوں کی
دعویدار ہے۔

اپنی عوامی زندگی کے اوائل میں سرسید احمد خاں عوام کی نمائندہ حکومت کے قیام کے مطالبہ کے حامی رہے۔ چنانچہ اپنی تصنیف اسباب بغاوت ہند (مطبوعہ ۱۸۵۸ء) میں انہوں نے ہندستان کی لیجسلیٹو کونسل سے ہندستانیوں کے دور رکھے جانے کو بھی بغاوت کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حکومت اپنے کسی اقدام کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ عوامی نمائندوں کے ردعمل سے قائم کر سکتی ہے اور عوامی نمائندوں کی صدائے احتجاج ہی نامناسب راستہ اختیار کرنے سے باز رکھ سکتی ہے لیکن کانگریس کے عالم وجود میں آنے کے بعد سرسید سیاسی اصلاحات کے بدترین مخالف بن گئے۔ رائے دہندوں کی ہر جہتی مشابہت کو عوامی نمائندہ حکومت کی تشکیل کی اولین شرط قرار دینے لگے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسید کی کانگریس دشمنی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ برطانوی حکمرانوں سے ہندستانیوں کے لئے سیاسی مراعات کا مطالبہ کرنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کم و بیش اسی بنیاد پر انھوں نے کلکتہ کی نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی مخالفت کی تھی جو ۱۸۷۷ء میں قائم کی گئی اور جس کے بانی امیر علی تھے۔ سرسید کا ایقان تھا کہ مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی ترقی برطانوی حکمرانوں کی امداد و اعانت کے بغیر ممکن ہی نہیں، ان کا یہی رویہ ہندستانی مسلمانوں کو اپنے ملک کی سب سے بڑی سیاسی تحریک سے بے تعلق رکھنے کا سبب بنا۔

سرسید خاں کی علی گڈھ تحریک کے دوران ہی اترپردیش کے ضلع سہارنپور

میں مسلم علماء اور دانشوروں کے ایک گروہ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی یہ نیا تعلیمی مرکز سنہ ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا، اور اس کے روح رواں مولانا محمد قاسم تھے مولانا قاسم کو سرسید ہی کی طرح شاہ ولی اللہ کی تعلیمات نے ایک نیا شعور عطا کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا بنیادی مقصد اسلامی تعلیمات اور اسلامی فلسفہ سے نئی نسل کو روشناس کرانا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس ادارہ نے ایک تعلیمی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور مغربی تہذیب وتمدن کی مخالفت ہی کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس ادارہ کا نصاب تعلیم علماء ہی مرتب کیا کرتے تھے یہ ادارہ سرسید کے قائم کردہ ادارہ سے اس اعتبار سے مختلف تھا کہ اس نے مغربی افکار کو شجر ممنوعہ قرار دیا۔ دارالعلوم دیوبند کے ارباب فکر و دانش کے اسی رویہ نے دارالعلوم دیوبند کو برطانوی تسلط کی مخالفت کا ایک بڑا مرکز بنا دیا تھا۔ چنانچہ جہاں سرسید احمد خاں مسلمانوں کو برطانوی تسلط کی مخالفت سے باز رکھنا چاہتے تھے وہیں دارالعلوم دیوبند کے علماء نے برطانوی سامراج کی مخالفت کو مسلمانوں کا اولین فریضہ قرار دیا اور ان کی جانب سے یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ مسلمان سرسید احمد خاں کے قائم کردہ ادارہ پیٹریاٹیک ایسوسی ایشن سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے اور ان ہی کے زیر اثر دارالعلوم سے وابستہ ایک گروپ نے گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون میں بھی حصہ لیا۔

سرسید کی علی گڑھ تحریک اور دارالعلوم دیوبند، دونوں ہی سے اختلاف رکھنے والے قدرے آزاد خیال مسلمانوں نے لاہور میں ۱۸۸۵ء میں انجمن حمایت اسلام کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد اسلامی تعلیمات کو معقولیت پسندی سے ہم آہنگ بنانا اور اسلام پر مختلف گوشوں سے کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دینا تھا۔ اس ادارہ نے مسلم لڑکوں، اور لڑکیوں کی اس ڈھنگ سے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی قبول کی کہ وہ

وہ اپنی زندگی کو اسلامی اور قرآنی تعلیمات پر ڈھال سکیں اس ادارہ کے ارباب مجاز نے بھی سرسید ہی کی طرح برطانوی حکمرانوں، کی تائید و حمایت کا راستہ اپنایا۔

سرسید اور ان کے ہمنواؤں کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنے والے ذاکر صاحب کا رجحان بھی موافق برطانیہ ہونا چاہیئے تھا لیکن ان کی ابتدائی تعلیم اور ان کی بالغ نظری انھیں "ہیں بزرگان" پر مطمئن نہ رکھ سکی۔ ان کی فکر کا دھارا ایک ایسے راستہ پر چل پڑا جو اس دور کے "صاحبانِ نظر" کا راستہ تھا۔

طفولیت

ذاکر صاحب نے آفریدی افغانوں کے ایک خوشحال گھرانے میں جنم لیا تھا جو اتر پردیش کے فرخ آباد ضلع کے چھوٹے سے شہر قائم گنج میں آباد ہو گیا تھا۔ افریدی پٹھانوں کی شجاعت و بہادری و عسکریت انھیں ورثہ میں ملی تھی ذاکر صاحب کے دادا غلام حسین خاں جو ایک اعلیٰ فوجی عہدہ پر مامور تھے۔ قائم گنج چھوڑ کر اورنگ آباد چلے آئے جو ان دنوں نظام حیدرآباد کی عملداری میں شامل اور ریاست حیدرآباد کے علاقہ مرہٹواڑہ کا صوبائی ہیڈکوارٹر تھا اُن کے صاحبزادے یعنی ذاکر صاحب کے والد جناب فدا حسین خاں نے سولیٹیت کے پیشہ سپہ گری کو چھوڑ کر قانون کی تعلیم حاصل کی تو شجیع پٹھانوں کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن فدا حسین خاں نے اپنی راہ نہ بدلی ـــ اور بہت جلد ان کا شمار سرکردہ وکیلوں میں ہونے لگا وہ اورنگ آباد سے پہلے ہی حیدرآباد چلے آئے تھے۔ اپنی محنت سے انھوں نے تھوڑی سی پونجی بھی جمع کرلی۔ تاریخی شہر حیدرآباد کے قدیم محلہ بیگم بازار میں اپنے لئے دو منزلہ مکان بھی بنو لیا۔ اسی مکان میں جو اب تک موجود ہے، ذاکر صاحب نے ۱۸۹۷ء میں جنم لیا۔ ان کی پیدائش کے بعد ان کے والد ماجد ضلع پربھنی کے منصف مجسٹریٹ مقرر ہوئے ـــ ایک کھرے دیانت دار بے لاگ آفیسر کی حیثیت سے فدا حسین خاں عوام میں بڑی عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے ابھی وہ عمر کی ۲۹ ویں منزل

ہی میں تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اپنے لواحقین میں انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کے علاوہ سات لڑکے مظفر حسین خاں، عابد حسین خاں، ذاکر حسین خاں، زاہد حسین خاں یوسف حسین خاں جعفر حسین خاں، اور محمد حسین خاں چھوڑے۔ ان میں سے اب صرف یوسف حسین خاں اور محمود حسین خاں، بقید حیات ہیں۔ مظفر حسین خاں اور عابد حسین خاں کا جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ جعفر حسین خاں تو بچپن ہی میں اپنے والدین کو داغ مفارقت دے گئے اور ذاکر صاحب بھی ہم میں نہیں رہے ہیں۔

ذاکر صاحب کی ابتدائی تعلیم شہر حیدرآباد کے اس مدرسہ میں ہوئی جسے اب سلطان بازار گورنمنٹ اسکول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے دور میں اس مدرسہ کا ایک ہاسٹل بھی تھا۔ اس مدرسہ میں ان کے بعض ہم جماعت' جو زندہ و سلامت ہیں شرمیلے اور وضعدار ذاکر صاحب کا بڑے ہی پیار و محبت سے ذکر کرتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں جناب فدا حسین خاں کے انتقال کے بعد ذاکر صاحب کی والدہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے آبائی شہر قائم گنج کو چلی گئیں۔ کچھ عرصہ تک ان کی تعلیم گھر ہی پر ہوتی رہی۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے بھی اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے ذاکر صاحب ہی کے استاد کی خدمات حاصل کیں اور اس طرح ذاکر صاحب کا مکان چند ہی دنوں میں ایک مکتب بن گیا۔ ۱۹۰۸ء میں ذاکر صاحب کو اٹاوہ کے ایک رہائشی اسکول میں داخل کیا گیا۔ اپنی زندگی کے اس ابتدائی دور میں ذاکر صاحب والدہ کے بڑے چہیتے رہے۔ اور ان کے کردار کی تعمیر و تشکیل میں اس نیک اور فرشتہ صفت خاتون کا بڑا دخل رہا۔ چنانچہ ان کے قریبی عزیز و اقارب ان کے بارے میں یہی کہا کرتے تھے کہ ان کی بہت سی عادتیں ان کی والدہ سے ملتی ہیں۔ ذاکر صاحب کی والدہ محترمہ بے حد دور اندیش خاتون واقع ہوئی تھیں اور ان کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اپنے شوہر کی کم عمری میں وفات کے باوجود، اپنے لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی' جب ذاکر صاحب کو اٹاوہ کے بورڈنگ ہاؤز میں داخل کرنے کا مسئلہ درپیش تھا تو ان کے کئی عزیزوں نے سمجھایا کہ وہ اپنے لڑکے کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

لیکن اپنے لڑکے کے مستقبل کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ ان کا یہ فیصلہ بلاشبہ ذاکر صاحب کے لیے بڑا مفید ثابت ہوا اور اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول ہی میں انھیں چند ایسی شخصیتیں ملیں جن کی چھاپ ذاکر صاحب کے انداز فکر پر نمایاں رہی۔ اسی مدرسے کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین بڑے نیک نفس نیشنلسٹ ہندستانی تھے اسکول کے مینیجر مولوی البشیر صاحب کا شمار بھی اس وقت کے دانشوروں میں ہوتا تھا۔ وہی اس مدرسہ کے بانی بھی تھے وہ "البشیر" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا کرتے تھے۔ مولوی بشیر کو سر سید احمد خاں کی رفاقت بھی حاصل تھی لیکن وہ سرسید کی سیاست، اور ان کے انداز فکر کے مخالف تھے۔ الطاف حسین صاحب تھے تو انگریزی اور ریاضی کے استاد، لیکن کبھی کبھی وہ دینیات کا درس بھی دیا کرتے۔ ذاکر صاحب ان کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ چنانچہ ان کے مدرسہ چھوڑنے کے کئی سال بعد تک وہ اپنے شاگردوں کو ان کی ذہانت، فراست اور سعادت مندی کا حال سنایا کرتے تھے۔ اٹاوہ کے اسی مدرسہ سے ذاکر صاحب سیاست میں دلچسپی لینے لگے ان دنوں جنگ طرابلس جاری تھی۔ سارے ہندستان میں اٹلی کے جارحانہ حملوں کی مذمت اور ترکوں کی ہمدردی میں جلسوں کا ایک سلسلہ سا جاری تھا۔ ذاکر صاحب کی ساری ہمدردیاں بھی ترکوں کے ساتھ تھیں انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ گوشت کھانا ترک کردیں، اور اس طرح جو بچت ہو وہ ترکوں کے لئے بھیج دی جائے۔ اس سے ہٹ کر ذاکر صاحب گلی گلی، کوچے کوچے گھوم کر ترکوں کی ہمدردی میں جذباتی تقاریر کرتے۔ ان کے لئے چندے اور عطیئے جمع کرتے۔ جمعہ کی نماز کے بعد مساجد میں چندوں کی وصولی کی مہم بھی ذاکر صاحب ہی نے شروع کی تھی۔ ان کے قریبی دوست اور ہمعصر پروفیسر حبیب الرحمٰن کے بیان کے مطابق ذاکر صاحب کو جنگ طرابلس سے اتنی دلچسپی ہوگئی تھی کہ وہ ہر روز اخبار "پانیر" کا تازہ شدہ جلد از جلد حاصل کرنے کے لئے مدرسہ سے ریلوے اسٹیشن پیدل جاتے اور اخبار خرید کر دوڑتے ہوئے اسکول واپس ہوتے۔

تاکہ اپنے منتظر دوستوں کو جنگ کی تازہ ترین خبروں کا ترجمہ سنا سکیں۔ خبروں پر تبصرہ بھی ان کا معمول سا بن گیا تھا۔ سید الطاف حسین ذہین طلباء کی حوصلہ افزائی کے لئے کافی مشہور تھے۔ ان کے گھر کے دروازے یوں تو تمام طلباء کے لئے کھلے رہتے تھے لیکن خاص طور پر ذاکر صاحب کے لئے ان کا دیوان خانہ ایک ڈیبیٹنگ ہال کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ الطاف حسین صاحب سے عصری سیاسی مسائل پر وہ گھنٹوں تبادلہ خیال کرتے۔ ذاکر صاحب کے لیل و نہار اسی عالم میں گزر رہے تھے کہ ان کے گھر پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ۱۹۱۱ء میں قائم گنج میں پلیگ کی وبا پھوٹ پڑی۔ اور ذاکر صاحب کا سارا خاندان اس وباء کی نذر ہو گیا۔ ان کی والدہ محترمہ پر بھی اس مہلک مرض کا حملہ ہوا۔ جب ان کا آخری وقت آیا تو لوگوں نے انھیں صلاح دی کہ ذاکر صاحب کو اٹاوہ سے بلا لیں لیکن اس باہمت خاتون نے مشورہ قبول نہیں کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ذاکر صاحب امتحان چھوڑ کر قائم گنج چلے آئیں۔ اور ان کی زندگی کا ایک سال ضائع ہو۔ والدہ کے انتقال کے بعد ذاکر صاحب کا کچھ عجیب عالم ہو گیا۔ دل پر غم کی جو گھٹا چھائی ہوئی تھی وہ انھیں افسردہ و ملول رکھنے لگی۔ کھانا چھوٹ گیا۔ دوست احباب سے گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی اور اسی عالم میں انھیں ایک مردِ خدا نے سہارا دیا۔ صوفیانہ افتادِ طبع کے حامل حسن شاہ نے ذاکر صاحب کے دلِ یتیم کا مداوا ڈھونڈ نکالا۔ ذاکر صاحب سے ان کی دور کی قرابت بھی تھی اور اسی لئے وہ کبھی کبھی ذاکر صاحب کے گھر آجاتے تھے۔ حسن شاہ رعشہ کے مریض تھے اور اسی لئے انھیں لکھنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی وہ جب بھی ذاکر صاحب کے گھر آتے تھے اپنے ساتھ مخطوطات کا ایک پشتارہ اٹھا لاتے، اور ذاکر صاحب سے ان مخطوطات کی نقل کراتے اس طرح ذاکر حسین ایک اچھے خاصے خوش نویس بن گئے۔ ان فارسی مخطوطات کی نقل کرتے ہوئے انہوں نے حسن شاہ صوفی کی مدد سے اس زبان پر کافی عبور حاصل کر لیا۔ حسن شاہ نے ذاکر صاحب کو جلد بندی کا فن بھی سکھایا۔ پورے چار سال تک ذاکر صاحب کو حسن شاہ صوفی کی رشد و ہدایت سے استفادہ کا موقع ملا۔ والدہ محترمہ کی زندگی میں تو ذاکر صاحب بڑے گھرانوں کے بچوں کی طرح بگی سے نہیں اترتے تھے لیکن حسن شاہ کی صحبت نے انھیں عوام کی زندگی سے

روشناس کرایا وہ انہیں اپنے ساتھ بیدل بازار لیجاتے گلی کوچوں میں لئے لئے پھرتے اور اپنی ساری پونجی یہ کہہ کر ذاکر صاحب کے حوالے کر دیتے کہ یہ ان کے کسی کام کی نہیں ہے ذاکر صاحب بھی شروع ہی سے سنجیدہ اور مرنجاں مرنج واقع ہوئے تھے وہ بھی اس روپے کو امانت کی طرح رکھتے اور جب بھی کوئی ضرورت مند آتا تو اس کی مدد کرتے۔ حسن شاہ دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا نوخیز شاگرد روپیہ کس طرح صرف کرتا ہے جب انھوں نے اندازہ کر لیا کہ ذاکر صاحب ضرورت مندوں کی مدد کے سوا کسی اور مد پر ان کا دیا ہوا روپیہ خرچ نہیں کرتے تو انھیں اطمینان ہوا اور وہ ذاکر صاحب کی عادت و روایت کی ستائش بھی کرنے لگے۔ حسن شاہ نے فیاضی اور فراخدلی کا جو درس ذاکر صاحب کو ابتدائی عمر میں دیا تھا وہ زندگی بھر باقی رہا۔ چنانچہ اپنی آخری سانسوں تک ذاکر صاحب ضرورت مند افراد کی مالی مدد کرتے رہے اور وہ بھی اس طرح کہ لینے اور دینے والے کے سوا کسی کو اس کا حال معلوم نہ ہو سکے

ہندستان کو مسلم صوفیاء کی دین

ڈاکٹر ذاکر حسین کے افکار و خیالات پر خدا ترسی اور نیک نفسی کا گہرا اثر چھوڑنے والے حسن شاہ کو ایک واقعہ نے انسانیت دوستی کی راہ پر لا ڈالا تھا۔ حسن شاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شاہ طالب حسین فرخ آبادی کے مُرید تھے جنھوں نے کافی غور و فکر کے بعد اپنے آباء و اجداد کی طریقت سے کنارہ کش ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ حسن شاہ نے ایک دن اپنے مرشد کی موجودگی میں ہندوؤں کے تعلق سے بعض ایسی باتیں کہیں جو دل آزاری کا سبب بن سکتی تھیں۔ اپنے مرید کا یہ انداز فکر شاہ طالب حسین پر گراں گذرا۔ حسن شاہ نے بڑی منت و سماجت کی۔ اپنے کئے دھرے کی معافی مانگی لیکن شاہ طالب حسین نے ایک نہ سنی۔ اور اپنے مُرید کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ماتھے پر قشقہ لگا کر کشمیر سے پیدل حیدرآباد جائیں اور حسن شاہ نے مرشد کے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنی ساری زندگی سفر میں گذار دی۔ کتابوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے وہ شہر شہر کی گشت کرتے اور جب بھی ذخیرہ کتب بہت زیادہ ہو جاتا تو اسے کسی بیل گاڑی

یں لا کر اس کے پیچھے رواں دواں نظر آتے۔ حسن شاہ نے اپنی زندگی کے چار سال ذاکر صاحب کو دیئے تھے، اور ان ہی کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ ذاکر صاحب قومی یکجہتی کے بہت بڑے علمبردار بن گئے۔ ایک دفعہ حسن شاہ نے ذاکر صاحب سے پوچھا تم نے کبھی شراب پی ہے، اور ذاکر صاحب نے بڑی صفائی سے جواب دیا "چھوا تک نہیں ہوں قبلہ۔" مرشد نے کہا "مگر میں نے تو پی ہے، اور تمہیں بھی مشورہ دوں گا کہ اگر مناسب ساقی مل جائے تو اس کے ہاتھوں کا جام چڑھا لینا۔ اور ذاکر صاحب نے کافی عرصہ کے بعد محسوس کیا کہ مناسب ساقی، حسن شاہ کی صورت میں انھیں مل چکا تھا۔ اور انھوں نے بادۂ علم و دانش کے نہ جانے کتنے ہی جام پی بھی لیے تھے۔ حسن شاہ کی طرح کتنے ہی صوفیوں نے ہندستان میں یگانگت و اخلاق کے مینا کھول رکھے تھے۔ انیگلز نے یورپ کے عہد وسطیٰ میں جاگیردارانہ نظام کی مخالفت کی تحریکوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس مخالفت نے کہیں صوفیانہ مشرب کی شکل اختیار کرلی تو کہیں حالات نے اسے مسلح جدوجہد کا روپ دیدیا۔ یورپ ہی پر کیا موقف ہے خود ہندستان میں بھی سولہویں صدی عیسوی کی بیشتر سماجی تحریکیں مسلم صوفیوں کے افکار و خیالات کی آئینہ دار رہی ہیں ڈاکٹر تاراچند کے الفاظ میں مسلم صوفیوں نے لاتعداد ہندوؤں پر بھی اپنا اثر ڈالا، اور زندگی کے تعلق سے ایک نیا نقطۂ نظر عطا کیا۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں، مسلمانوں نے ہندستان کے جو علاقے فتح کیے تھے وہی مسلم صوفیا کی تعلیمات، اور رشد و ہدایت کا بڑا مرکز بنے رہے۔ ہندستان کے درویشوں اور صوفیوں کے مکاتب خیال کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنیشد اور ویدانت کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی تعلیمات کا ایک اہم جُزو یہ تھا کہ انسان کے جسم خاکی کے فنا ہونے کے بعد اس کے اندر چھپا ہوا الوہیت کا عنصر، اس کے خالق حقیقی کی ذات سے جا ملتا ہے۔ نکلسن نے صوفیوں کے تصورِ فنا کے بارے میں، یہ رائے ظاہر کی تھی کہ وہ بدھ مت کے "نروان" کے تصور سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔

صوفیانہ مشرب دراصل سماجی اور معاشرتی تصورات میں تضاد و تصادم کی

پیداوار تھا۔ ہمارے ملک کے سب ہی صوفی عیش وعشرت کی زندگی کو ناپسند کرتے تھے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ عیش وعشرت کی زندگی صرف امراء کے حصہ میں آتی ہے بہ الفاظ دیگر وہ امارت کے مخالف رہے ہیں اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے انھوں نے سادہ زندگی اور تمام انسانوں کے ایک ہی کنبے سے منسلک و مربوط ہونے کے تصور کو ابھارا وہ محسوس کرتے کہ اسلام تابع مملکت و سلاطین ہوتا جا رہا ہے علماء، ملاء اور قاضی بھی حکومت کے اشارۂ ابرو پر رقص کرنے لگے ہیں۔ صوفیوں کو اس بات سے سخت ملال ہوتا تھا کہ ناانصافیوں اور استحصال کے باوجود علمائے وقت مہر لب رہتے ہیں انہی حالات نے انھیں گوشہ نشین اور تارک الدنیا بنا دیا ہے، اور وہ تزکیہ نفس اور روحانی برگزیدگی ہی کو اپنا نصب العین قرار دینے لگے۔

صوفیوں نے اقبال کے الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا کہ ان کا شعار "امیری نہیں غریبی ہے۔ وہ دنیاوی آسائشوں سے احتراز کرتے رہے اور ان کے اس شعار کو بھی جاگیردارانہ نظام اور مطلق العنانی کے خلاف احتجاج و بغاوت کی ایک علامت قرار دیا جا سکتا ہے وہ امیروں کی دولت، اور ان کی جاہ و حشمت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ان کے اس رجحان و رویہ کی بنیاد پر غریب طبقات انھیں بے حد عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندستان میں جیسے جیسے جاگیردارانہ نظام کا جبر و استبداد بڑھتا رہا ویسے ویسے صوفیوں کا حلقہ ارادت، وسعت پاتا رہا۔ اور بعض صوفیائے کرام تو ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے عتاب شاہی کا لحاظ کیے بغیر عوامی تحریکوں کی صاف اور واضح طور پر حمایت کی ہے۔ جہاں علمائے وقت مذہب سے متعلق ظاہری امور کی تکمیل کو سب کچھ سمجھتے تھے وہاں صوفیوں نے داخلی نظم و ضبط اور صفائی قلب کو راہ نجات قرار دیا، اور بعض صاحب نظر تو ایسے بھی گذرے جھنوں نے شاہان وقت کی طلبی پر بھی ان کے در دولت تک جانا مناسب نہ سمجھا اور خود شاہ وقت کو ان کے آستانہ کی جبہ سائی کرنی پڑی۔ قومی یکجہتی کا تصور انھیں

کی دین ہے۔ ہندوستان کی تاریخ بھگتی تحریک کو فراموش نہیں کرسکتی۔ اس تحریک کے بانی ہندو سنت تھے۔ انھوں نے مسلم صوفیا کی طرح ذات پات اور فرقہ وعقیدہ کے اختلاف کو نظرانداز کرکے اندر کے انسان کو جھنجھوڑا اور حقیقت یہ ہے کہ انھیں کی تعلیمات اور سرگرمیوں نے ہمیں ہندستان کی تہذیبوں کی بوقلمونی کے باوجود انسانی برادری کا تصور عطا کیا ہے۔ صوفیانہ مشرب کی جھلک شہنشاہ اکبر کے بڑے لڑکے دارالشکوہ میں بھی ملتی ہے چنانچہ اپنی تصنیف " سرِاکبری " میں دارا نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کائنات کے ہر ذرہ میں خدا کا جلوہ موجود ہے۔ اس لئے کوئی ضروری نہیں کہ کسی خاص طریقت یا راستہ پر چلنے والے ہی اس امر کا دعویٰ کریں کہ وہی راستہ خدا تک پہونچا سکتا ہے۔ اپنی ایک اور تصنیف " مجموعۃ البحرین " کے تمہیدی حصہ میں دارالشکوہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان اپنشیدوں کا ضابطہ اخلاق بھی اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے۔ خواجہ فریدالدین بابا نے صوفیانہ مشرب کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ صوفیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ درباداری، اور بادشاہوں کی خوشنودی کو اپنا شعار نہ بنائیں اور کسبِ حلال (جائز ذریعہ معاش) پر زندگی گذاریں۔ محمد نورنبیا نے اپنی انگریزی تصنیف " ہندستان میں اسلامی اندازِ فکر کے ارتقاء " میں خواجہ فریدالدین بابا کی تعلیمات، پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے متمول اور ذی ثروت مریدوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی ساری جائداد، فلاحی کاموں کے لیے وقف کردیں۔

ابن العربی (۱۱۶۵ تا ۱۲۴۰ء) نے پہلی مرتبہ صوفیانہ مشرب کو ایک معقول ومناسب طریقت کا روپ دینے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے خالق ومخلوق کے اوٹوٹ رشتہ کے حوالہ سے کہا تھا کہ مخلوق ہی میں خالق کا جلوہ نظر آتا ہے اور اپنے آپ کی تلاش کرنے والا ہی خدا کو پاسکتا ہے۔ اقبال نے بھی اپنے اس مشہور شعر میں ابن العربی کے اس نقطہ نظر کی ترجمانی کی ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اسی نظریہ کو صوفیائے کرام " وحدت الوجود " کے نظریہ کا نام دیتے ہیں اور اس کے متعلق خدا کی بنائی ہوئی ہر چیز محبت کے قابل بن جاتی ہے۔ " وحدت الوجود " کے نظریہ کے ماننے والوں کے لیے کسی بھی شئے سے نفرت کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ توقع کے مطابق ابن العربی کے اس نظریہ نے ان ملاؤں کے لیے بڑا ناسازگار ماحول پیدا کر دیا جو جنت اور دوزخ کے اجارہ دار بن بیٹھے تھے چنانچہ ان کے حلقوں میں اس نظریہ کی شدت سے مذمت کی جانے لگی۔

صوفیانہ مشرب کا تفصیلی جائزہ بظاہر اس کتاب کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا لیکن ذاکر صاحب کے اندازِ فکر کی تشکیل میں حسن شاہ کا جو دخل رہا ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ اسلامی صوفیوں کی فکری دین کا ذکر کیا جائے یوں بھی ہمارے قومی قائدین صوفیانہ مشرب اور بھگتی تحریک سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور ہوئے ہیں اسلامی صوفیا کے تعلق سے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لی جانی چاہیئے کہ انھوں نے تبلیغ کی مروجہ شکل و صورت کو اپنانے کے بجائے۔ بنی نوع انسان کی خدمت گذاری کی راہ اختیار کی، اور اپنے حسن و اخلاق سے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ ان کے طرز زندگی کے ساتھ ساتھ ان مابعد الطبقاتی علائم سے ان کا رشتہ ٹوٹنے لگا جنھیں وہ مافوق البشر تصور کرتے تھے اور قانون فطرت کو عنلائم کا عطیہ مانتے تھے۔ بالفاظ دیگر صوفیائے کرام نے ایک طرح کا سائنٹفک نقطۂ نظر بھی دیا ہے۔ صوفیا کے بڑے سلسلوں تر جن کے نام چشتی سہروردی قادری، شطاری اور نقشبندی ہیں۔ ہماری فکر پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء چشتی سلسلہ کے نہبت بڑے دانشور اور مفکر تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی، اس مقصد کیلئے وقف کر دی تھی کہ لوگوں کو عزت نفس کے ساتھ جینے کا سلیقہ سکھائیں، اور

دلوں کی کدورت دور کریں ۔چشتی سلسلہ کے بانی، خواجہ اجمیری تھے۔ جن کی درگاہ آج تک بھی مرجع خلائق بنی ہوئی ہے ہر فرقہ و مذہب کے لوگ، بڑی عقیدت و محبت سے اس کی زیارت کرتے اور خواجہ اجمیری سے التماس کرتے ہیں کہ وہ ان کی مرادوں کے برآنے کے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے ارشاد فرمایا تھا کہ نیکی اور پارسائی کا مطلب یہ نہیں کہ "آدمی ترک دنیا کر کے لنگوٹ کس لے اور کسی گوشہ میں منھ چھپا کر پڑا رہے، ان کے نزدیک ترک دنیا کا یہ طریق عبادت کی تعریف میں بھی نہیں آتا۔ وہ صرف خدمت خلق پر زور دیا کرتے تھے۔ ان کے عقیدت مندوں میں شاہ و گدا، امیر و فقیر، عالم و جاہل غرض سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ ان کے ارشادات نے دنیائے فکر و علم کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کیا تھا۔ دہلی میں ان کے مزار مبارک پر آج بھی ہر قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ صوفیائے کرام کی تاریخ میں جہاں خواجہ اجمیری، حضرت نظام الدین اولیا، امیر خسروؒ کے نام ملتے ہیں جنھوں نے امیر و غریب برتر و کمتر کے تفاوت پر کاری ضرب لگائی، وہیں لیا محسوس ہوتا ہے کہ بعض شخصیتوں نے مساوات و انسانیت دوستی کا درس دیکر عتاب سلطنت کا ہدف بننے کی بجائے اس وقت کے سماجی نظام سے سمجھوتہ کرلیا اور اس طرح "اعلائے کلمتہ الحق" کی خصوصیت سے محروم ہوگئے۔ خاص طور پر مغل سلطنت کے آخری دور میں مفاہمت پسندی کے اس رجحان کو بڑی تقویت حاصل ہوگئی تھی۔ تاہم مردانِ حق آگاہ سے کوئی دور محروم نہیں رہا۔ ذاکر صاحب کے روحانی استاد "شاہ حسن" بھی غالباً ان چند صاحب نظر اصحاب تھے جنھوں نے زمانہ کے "سرد و گرم" کے باوجود "تو با زمانہ بہ ساز" کے آسان نسخہ کو آزمانا پسند نہ کیا۔

———•———

اینگلو اورنٹیل کالج علیگڈھ

ذاکر صاحب نے ۱۹۱۳ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی درجہ میں کامیاب کیا اور انٹرمیڈیٹ کے لئے اینگلو اورنٹیل کالج میں داخلہ لیا۔ ان کے دو بڑے بھائی جناب عابد حسین خاں، اور مظفر حسین خاں پہلے ہی سے کالج میں تھے۔ ذاکر صاحب کے ان دونوں بھائیوں نے بھی کالج کے اساتذہ اور اپنے ساتھیوں پر اپنی ذہانت' اور ذکاوت کا بڑا اچھا نقش چھوڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ذاکر صاحب سے بھی اچھی توقعات وابستہ کی جانے لگیں۔ ابتداء میں علی گڈھ کالج کے لیل و نہار ذاکر صاحب پر قدرے گراں گذرے۔ اپنے داخلہ کے دن کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے علیگڈھ یونیورسٹی کے ۲۸ جنوری ۱۹۵۷ء کے خطبہ تقسیم اسناد میں بتایا ہے کہ کس طرح وہ ڈائیننگ ہال کا پتہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے وقت پر وہاں پہونچ نہ سکے اور انھیں بغیر کچھ کھائے بیئے رات گذارنی پڑی۔ لیکن جلد ہی ذاکر صاحب کالج کا ایک جزو لازم بن گئے۔ ان کی خوش طبعی ملنساری اور بصیرت کی بناء پر ان کے ساتھیوں نے انھیں "مرشد" کا لقب عطا کیا تھا۔ ذاکر صاحب کو اس عہدہ کے خوشحال گھرانوں کے بچوں کی طرح آرام و آسائش کی زندگی اچھا لباس اچھا کھانا عزیز تھا کالج کی زندگی کے بعد کے دور میں بھی یہ سارے شوق ان کی شخصیت کا ایک جزو بنے رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ذاکر صاحب کی ان تمام خصوصیات پر ان کی ذہانت فکر غالب رہی۔ ایم۔اے کی تیاری کے ساتھ ساتھ ذاکر صاحب نے طلباء کو پڑھانا بھی شروع کیا۔ اور خود ان کی کسی سعی کے بغیر طلباء نے انھیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ چنانچہ بیشتر طلباء کے وفود کی قیادت ذاکر صاحب ہی کیا کرتے تھے دوسری طرف اساتذہ کے حلقہ میں بھی ان کا بیحد احترام کیا جاتا خاص طور پر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاءالدین ان کی بہت قدر کرتے تھے حالانکہ افتاد طبع اور سیاسی نقاط نظر کی رو سے یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ڈاکٹر ضیاءالدین" سر سید اسکول" کے حامی' اور

ذاکر صاحب پکے نیشنلسٹ اور مخالف سامراج ؛ علی گڑھ، ہر دور میں اختلاف خیالی کا مرکز بنا رہا ہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے دور میں تو طلباء لاتعداد سیاسی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے لیکن یہ ایک عجیب بات تھی کہ ہر مکتب خیال کے طلباء ذاکر صاحب کی دل سے عزت کیا کرتے تھے۔ ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ ذاکر صاحب اس زمانہ میں کسی خاص جماعت سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ نیشنلسٹ اور مخالف سامراج رجحان رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی کا اخبار "کامریڈ" ان کا محبوب اخبار تھا مولانا محمد علیؒ کی تحریروں کو ان کی فکر کو ایک نئی جہت دینے میں بڑا دخل رہا ہے اپنی زندگی کے آخری دور میں ذاکر صاحب کامریڈ کے بعض شماروں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ شمارے صحافت میں "کلاسیکی" کی حیثیت رکھتے ہیں" الہلال اور البلاغ" میں مولانا آزاد کے رشحات قلم سے بھی انہوں نے اکتساب کیا۔ اسلامی تعلیمات کی روح تک پہونچنے میں مولانا آزاد کے مضامین کو ذاکر صاحب نے مشعل راہ بنایا تھا۔ اپنی زندگی میں ذاکر صاحب نے جن چند دانشوروں کا اثر قبول کیا، وہ مولانا آزاد کو بھی ان میں شامل کرتے تھے۔

۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۰ء کے جوان سال ذاکر صاحب کو اپنی ذہانت کا لوہا منوانے میں کوئی دقت یا دشواری پیش نہ آئی۔ لیکن ان کے بے مثال کردار نے ان کی شخصیت میں اور زیادہ اضافہ کیا، جو ان کی والدہ محترمہ کی تربیت کی دین تھا۔ جناب رشید احمد صدیقی کو اس بات کا شرف حاصل ہے کہ وہ علیگڈھ کی اس درسگاہ میں ذاکر صاحب کے اولیں دوست کہلائے جاتے ہیں۔ ان سے مولانا اقبال احمد خاں سہیل نے ذاکر صاحب کا تعارف کرایا تھا۔ رشید صاحب نے بھی اپنے اس دوست کی فطرت کی گہرائیوں کا اندازہ کر لیا۔ چنانچہ اپنے مضمون "موجہ گل سے چراغاں ہے گذرگاہ خیال" میں لکھتے ہیں۔

"۱۹۱۵ء میں ایم اے او کالج میں داخلہ لیا، اور

ذاکر صاحب سے پہلے پہل ملاقات ہوئی موصوف دو ایک سال پہلے سے یہاں طالب علم تھے جو نہد سے آیا تھا جو کبھی علم و فضل اور شرافت و شائستگی کا گہوارہ رہ چکا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے ذاکر صاحب کے دو بڑے بھائی مظہر حسین خاں اور عابد حسین خاں مرحومین یہاں کے طالب علم رہ چکے تھے ان میں سے کسی کو میں نے نہیں دیکھا لیکن ان کی شرافت اور ذہانت کا چرچا ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا اس کی تصدیق ذاکر صاحب کی پاکیزہ سیرت غیر معمولی قابلیت اور دلکش شخصیت سے اس طرح ہوتی تھی جیسے ان بھائیوں میں سے کسی سے براہ راست متعارف ہونے کی ضرورت نہ رہ جاتی ہو۔"

آگے چل کر وہ ذاکر صاحب کا سراپا ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:۔

"کالج میں ذاکر صاحب کا شمار اس وقت کے مثالی طلباء میں تھا۔ ساتھی طلباء بڑی عزت و محبت کرتے تھے، اور اساتذہ ان کی غیر معمولی ذہانت، قابلیت اور سیرت کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے۔ باوجود اس کے اس زمانہ کا یورپین اسٹاف، ذاکر صاحب کے نمونہ اور قسم کے طلباء سے کچھ زیادہ خوش گماں نہ رہتا تھا۔ سبب

یہ تھا کہ صورت حال کیسی ہی ہو، ذاکر صاحب
حفظ مراتب کے آداب اور تقاضوں کو کبھی
نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ خدا نے ان کو جن
صفات سے نوازا تھا۔ خود کو اس کا اہل اور شکرگذار
ثابت کرنے کے لئے انھوں نے جس مجاہدہ نفس
احتساب عمل اور احساس ذمہ داری کو تمام عمر
اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا اسے ان کا سب
سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔"

اس ہونہار طالب علم کی خواہش تھی کہ میٹرک کے بعد وہ سائنس سے انٹرمیڈیٹ کرکے طب کے کورس میں داخلہ لیں اور اس منصوبہ کے تحت انہوں نے انٹرمیڈیٹ سائنس کا امتحان کامیاب بھی کیا تاکہ کرسچین کالج لکھنؤ سے سائنس میں گریجویشن کرسکیں اور کسی میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے۔ لیکن ان کی علالت ان کے اس مقصد کی تکمیل میں رکاوٹ بن گئی اور ایک سال ضائع کرکے ذاکر صاحب کو دوبارہ علی گڈھ واپس ہونا پڑا۔ علی گڈھ میں گریجویشن کی تکمیل کے فوراً بعد ہی وہ ایم اے او کالج کی مضبوط، با اثر اور مستحکم اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر بھی منتخب ہوئے اور انھیں بہترین مقرر کی حیثیت سے انعامات بھی ملے۔ ایم اے او کالج اسٹوڈنٹس یونین کی انتخابی مہم کے دوران حریف امیدواروں کا تقریری مقابلہ بھی منعقد ہوا کرتا تھا اور اس میں جو امیدوار زور خطابت کا مظاہرہ کرتا اسی کی کامیابی یقینی ہوا کرتی تھی جس چناؤ میں ذاکر صاحب، نائب صدارت کے امیدوار تھے اس کے دوران ان کے حریف کے حامیوں اور دوستوں نے یہ افواہ اڑادی کہ ذاکر صاحب کو ایک پروفیسر نے تقریر لکھدی ہے اور اسے وہ ازبر کر رہے ہیں تاکہ تقریری مقابلہ کے وقت اس کا اعادہ کریں ذاکر صاحب کہاں ہار ماننے والے تھے۔ مقابلہ کے دن ان سے کہا گیا کہ وہ ایک قرار داد پیش کریں، اور

محرک کی حیثیت سے اس کی تائید میں تقریر کریں، ذاکر صاحب نے رسمی انداز میں دو جملے کہہ کر قرارداد پیش کر دی اور اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ ان کے حریفوں کے چہرے کھل اٹھے لیکن جب اپنے حریف کی تقریر کے اختتام پر بہ حیثیت محرک انھوں نے دوبارہ ایوان کو مخاطب کرنے کے حق سے استفادہ کیا اور اپنے محرک کی ایک ایک بات کی انتہائی معقول اور مناسب انداز میں تردید کی تو میدان ان ہی کے ہاتھ رہا اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع بھی نہ ملا کہ انہوں نے کسی پروفیسر کی تحریر کردہ تقریر کا اعادہ کیا ایم اے او کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کی نائب صدارت کا اعزاز کسی معمولی درجہ کے طالب علم کو نصیب نہیں ہوا کرتا تھا اور جن طلبا کو یہ اعزاز مل جاتا تھا وہ اپنے آپ کو دیگر طلبا سے برتر سمجھا کرتے تھے لیکن ذاکر صاحب کی افتادِ طبع نے نوجوانی کے اس مرحلہ پر بھی انھیں پابند وضع رکھا اور انہوں نے اپنے حسنِ اخلاق کا ایک ایسا گہرا نقش چھوڑا کہ ان کے ساتھی انھیں "مرشد" کے نام سے یاد کرنے لگے۔ ان کے بھائی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے الفاظ میں، علمی قابلیت کے علاوہ، ان کی سیرت کی چمک دمک بھی اپنوں اور غیروں کے لئے جاذب نظر تھی۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنے چوتھے بھائی زاہد حسین خاں سے ذاکر صاحب کے روابط و تعلقات کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ بھی ذاکر صاحب کے کردار و مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ ذاکر صاحب کی گھریلو زندگی کا بڑا دلکش نقشہ ڈاکٹر یوسف حسین نے یوں پیش کیا ہے:

> "ہمارے چوتھے بھائی زاہد حسین خاں تھے قدرت نے انھیں ہم سب میں زیادہ حسین صحت مند اور قوی بنایا تھا۔ یونانی مجسموں کا سا کھرا اسک نقشہ گٹھا ہوا جسم قد و قامت میں کڑیل جوان تھے رنگ بھی ہم بھائیوں سے اُجلا تھا طبیعت میں تمکنت نہ شان تھی جہاں دل میں بیٹھ جائے آپ سے

پورا کر کے چھوڑیں چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ ذاکر میاں سے پونے دو سال چھوٹے اور مجھ سے تین سال بڑے تھے۔ کبھی کبھی ذاکر میاں سے ان کی اَن بن ہو جاتی تھی جو اگرچہ عمر میں ان سے بڑے لیکن جسمانی قوت میں کم تھے ہر خاندان میں اوپر تلے کے بھائیوں میں اکثر چلتی رہتی ہے اس کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہو۔ اکثر اوقات مجھے یاد ہے کہ "ذاکر میاں زاہد میاں، سے کتراتے تھے" اور ان کے منہ نہیں لگتے تھے۔ البتہ حکمت عملی سے انھیں قابو میں رکھتے تھے۔ کبھی جب کھٹ پٹ ہو جاتی تو کئی کئی دن بات چیت بند رہتی لیکن پھر خود ہی میل ملاپ ہو جاتا آج نصف صدی بعد جب میں ان بچکانی لڑائیوں اور ناچاقیوں کو یاد کرتا ہوں اور اپنے حافظہ کو کھنگالتا ہوں تو مجھے اس میں عجیب و غریب لبیریں اور سبق پوشیدہ ملتے ہیں۔ مجھے اس وقت بھی یقین تھا اور اب بھی ہے کہ اس دن سب میں زیادتی زاہد میاں کی طرف سے ہوئی تھی۔ ذاکر میاں کے مزاج میں ان کے جسم کی طرح نرمی اور ملائمت تھی وہ ہمیشہ زاہد میاں کی زیادتیوں کو بڑے صبر و تحمل سے برداشت کرتے تھے۔"

ذاکر صاحب سے ان کے مزاج کی یہ نرمی کسی دور میں بھی رخصت نہ ہوئی لیکن

اس نرمی مزاج کا ان کے کردار کی استقامت پر کوئی اثر نہ پڑ سکا۔

جامعہ ملیہ کی تاسیس

ذاکر صاحب نے اینگلو اورینٹیل کالج چھوڑنے کے فیصلہ کے تعلق سے ایک دفعہ کہا تھا کہ "یہ میری زندگی کا منفرد فیصلہ تھا۔ اور میری بقیہ زندگی اسی فیصلہ کی تابع اور رہین منت ہے" انہوں نے اپنی عزیز درس گاہ جن حالات میں چھوڑی اور جس جذبہ کے تحت گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون میں ایک نئے انداز سے داخل ہوئے اس کی تفصیل پچھلے اوراق میں بیان کی جا چکی ہے۔ جامعہ کی ابتداء خواہ کسی جذبہ کے تحت ہوئی ہو لیکن یہ جذبہ اتنا شدید تھا کہ علیگڈھ کے ان طلباء نے جنھیں اپنی مادر علمی سے عشق تھا انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ایک دو دن نہیں مہینوں، خیموں میں گزرے۔ کیونکہ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ جس چار دیواری کو وہ افکار تازہ کا جگمگاتا گلستان سمجھتے رہے، اس کے در و دیوار ان کی روح کے لئے قید خانہ بن گئے ہیں۔ جامعہ ملیہ ابتدا میں کیا تھی۔ کرشن آشرم کے صحن میں خیموں کی قطار ان ہی خیموں میں مولانا محمد علی نے جو اس جامعہ کے پہلے پرنسپل تھے اپنے درس کا آغاز کیا۔ گھنٹہ، دو گھنٹہ، چار گھنٹے مسلسل بولے جا رہے ہیں اور سننے والے بت کی طرح بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ مولانا محمد علی کا جب بولتے بولتے گلا بند ہو جاتا تو بادل ناخواستہ کلاس برخاست ہوتی۔ علی گڈھ کالج چھوڑتے وقت ذاکر صاحب اسٹوڈنٹ لکچرار تھے۔ آرٹس میں ایم اے اور قانون میں گریجویشن کی تکمیل میں مصروف اور ایک بے مثال مقرر کی حیثیت سے سارے کالج میں مشہور، بہترین ادیب، بے مثال طالب علم۔ حالات نے اگر پلٹا کھایا ہوتا تو وہ بھی اپنے والد محترم کی طرح مشہور وکیل بنتے۔

ذاکر صاحب اور ان کے دیگر (۲۹۹) ساتھی کالج کے ارباب مجاز کی سختیوں کو برداشت کرتے ہوئے خیموں ہی میں پڑے رہے اور پھر وہ دن بھی آیا جب کہ کالج کے ارباب مجاز نے پولیس کی مدد سے آزادئ خیال کے ان علمبرداروں کو کالج کے احاطہ سے زبردستی باہر نکلوا دیا

ذاکر صاحب ان طلبا کے قائد تھے جو مولانا محمد علی کی سرکردگی میں اولڈ بائیز کالج سے باہر نکلے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک قومی تعلیمی ادارہ کے قیام کا فیصلہ کیا۔ ہندستان کے تیسرے صدر جمہوریہ بننے کے بعد ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ اس اعلیٰ عہدہ کے لئے میرے انتخاب کا بظاہر ایک ہی سبب نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے ملک کے عوام کو خواندہ بنانے کی اہم تحریکوں سے وابستہ رہا ہوں اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسی جامعہ ملیہ نے جو اپنے نقطہ آغاز پر کرشن آشرم کے خیموں تک محدود تھی۔ انھیں علم اور استاد کا شرف اور اعزاز عطا کیا انھیں ایک ایسے پیشہ سے وابستہ کیا جسے ہندستانی تہذیب میں بہت اونچا مقام حاصل تھا لیکن جسے ہمارے سماج نے بالکلیہ نظر انداز کر دیا ہے۔ ذاکر صاحب کے لئے درس و تدریس ہی ان کی زندگی کا مشن تھی۔ وہ اگر چاہتے تو بڑی آسانی سے نظروں کو خیرہ کرنے والی زندگی سے وابستہ ہو جاتے' لیکن ان کی شرافت نفس نے انھیں استاد کی عظمت و تقدیس سے محروم ہونے نہ دیا۔ جامعہ ملیہ کے قیام اس کے مخصوص اساتذہ اور باشعور طلبا کے اولین گروہ کی ذہنی ساخت کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ دراصل قومی احساس کی پذیرائی کی اولین منزل تھا۔

ذاکر صاحب اگر چاہتے تو ضمیر کی آواز کو ان سنی کر کے' ایم' اے' او کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین کی پیش کش قبول کر لیتے، اور کسی بڑے عہدہ پر فائز ہو جاتے لیکن ایم اے کے اس ہونہار طالب علم نے اس احساس کے ساتھ ساتھ کہ جامعہ قائم ہو گئی ہے اور اسے قائم رکھنا ہے۔ اسے اپنا نصب العین بنا لیا نہ معاوضہ کی فکر نہ عہدہ کا خیال! اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ کام کرنے والوں کی ضرورت تھی اور سب سے زیادہ صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔ پروفیسر مجیب نے سچ ہی تو کہا ہے کہ جامعہ کی بقا کے لئے صرف ایسا صبر ہی کافی نہیں تھا' جو آدمی میں صرف برداشت کی طاقت پیدا کرے، بلکہ ایسے صبر کی جو عزم کی صورت بن جائے' حالات پر غالب آنا سکھائے جو موجود ہو محسوس نہ ہو جیسے صوفیوں کا فاقہ کہ چہرہ کو رونق اور دل کو سرور بخشتا ہے اور ہمت بھی ایسی چاہئے

تھی جو اپنے اندر روانی کی طاقت پیدا کرے کسی شخص، کسی امید، کسی خیال کی دستگیر نہ ہو اور یہ سب باتیں ذاکر صاحب کی ذات میں موجود تھیں ترکی کی مشہور ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے جو جامعہ ملیہ سے بڑی دلچسپی رکھتی تھیں اس درس گاہ کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ادارہ کے دو مقصد تھے ایک تو یہ کہ ہندوستان کے مسلم نوجوانوں کو اس بات سے روشناس کرایا جائے کہ ہندستانی شہریوں کی حیثیت سے ان کے حقوق کیا ہیں اور ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ اسلامی اندازِ فکر کی تحریک سے فائدہ اٹھا کر ان نقاط مشترکہ کا پتہ چلایا جائے جو ہندو مت اور اسلام کی مشترک قدروں کا کام دے سکتے ہوں۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہندستانی قومیت کا ایک ایسا تصور پیش کرنا چاہتی تھی جو اسلامی تعلیمات کے مغائر و منافی نہ ہو۔ ذاکر صاحب نے جب اینگلو اورنٹیل کالج چھوڑا تو اس وقت ان کے ذہن میں جامعہ کی اس ہیئت ترکیبی کا ایک واضح خاکہ موجود تھا۔ علی گڑھ کالج کے زمانہ ہی میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندستان سے باہر جانے کی فکر میں تھے۔ لیکن تحریک عدم تعاون سے ان کی وابستگی اس منصوبہ کی تکمیل میں رکاوٹ بن گئی لیکن جب جامعہ کا قیام عمل میں آیا اور اس نے کام شروع کر دیا تو ذاکر صاحب کے دل میں یہ سوئی ہوئی خواہش جاگ اٹھی۔ جامعہ کو قائم ہوئے تین سال گذر رہے تھے کہ انھوں نے باہر جانے کی تیاری شروع کر دی لیکن پاسپورٹ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ذاکر صاحب کو ایک نیشنلسٹ کی حیثیت سے یہ بات بھی گوارا نہ تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ کا انتخاب کریں جس کی تاناشاہی کے خلاف وہ نبرد آزما تھے۔ ان دنوں ہندستان کے نیشنلسٹ طلبا کو جرمنی بہت پسند تھا ذاکر صاحب جس زمانہ میں جرمنی کے لئے پر تول رہے تھے اتر پردیش کے بورڈ آف ریونیو کے ایک رکن مسٹر فری بیاٹیل تھے۔ مسٹر فری بیاٹیل کے ایک کلرک کا فرائض منصبی کی انجام دہی کے دوران انتقال ہو گیا تھا، اور ایک نیک نفس عہدہ دار کی حیثیت سے مسٹر فری بیاٹیل نے اپنے مرحوم کلرک کے لڑکے اشفاق کی نگہداشت، پرورش، پرداخت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کر رکھی تھی۔ اشفاق ذاکر صاحب کے علی گڑھ کے دوستوں میں شامل تھے

اور انہوں نے بھی ذاکر صاحب کے ساتھ ہی ایم اے او کالج چھوڑا تھا۔ مسٹر فری فیاٹل کو اشفاق کے اس اقدام سے سخت اختلاف تھا۔ چنانچہ انھوں نے اشفاق کو بری طرح لتھاڑا۔ انھیں، غبی کند ذہن اور کمزور طالب علم کے الفاظ سے نوازا گیا اور اس کے جواب میں اشفاق نے فری فیاٹل کو بتایا کہ ان ہی پر کیا موقوف ہے۔ علی گڑھ کالج کی ناک، ذاکر حسین نے بھی کالج چھوڑ دیا ہے، فری فیاٹل نے اشفاق کی زبان سے ذاکر صاحب کی ذہانت و ذکاوت کے متعدد واقعات سنے اور ان سے خواہش کی کہ وہ کسی وقت ذاکر صاحب کو اپنے ساتھ لائیں۔ بالآخر ایک دن، ذاکر صاحب کا فری فیاٹل سے تعارف ہو گیا توقع کے مطابق فری فیاٹل نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ذاکر صاحب جیسے ذہین طالب علم نے کالج چھوڑ کر اپنا نقصان کیا ہے۔ اس نے انھیں صلاح دی کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ جائیں ذاکر صاحب کے دل کی بات فری فیاٹل کی زبان پر آ ہی گئی تھی۔ انھوں نے جرمنی جانے کی خواہش کا اظہار کئے بغیر فری فیاٹل کو بتایا کہ وہ خود بھی باہر جانے کے آرزومند ہیں لیکن پاسپورٹ انھیں مل نہیں رہا ہے۔ فری فیاٹل نے اس خصوص میں ان کی امداد و اعانت کا وعدہ کیا اور بات یہیں پر ختم ہو گئی۔ چند دنوں بعد ذاکر صاحب کو علی گڈھ کے کلکٹر نے بلا بھیجا اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ ہندستان کے باہر جانا چاہتے ہیں ذاکر صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ شائد فری فیاٹل نے ان سے ذاکر صاحب کی سفارش کی ہے کلکٹر علی گڈھ نے قدرے ہیں بچیں ہو کر پوچھا کہ وہ فری فیاٹل کو کب سے جانتے ہیں، اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک انگریز آفیسر، دلوبی، کے تامل سے بھی فری فیاٹل کی بڑی دوستی تھی کلکٹر کے اس ریمارک نے ذاکر صاحب کو مایوس کر دیا تھا۔ مگر ان کی توقع کے برخلاف برطانیہ کا پاسپورٹ مل گیا

ا بیرونی سفر

ذاکر صاحب نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں انھوں نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اپنے قدیم دوست خواجہ عبدالحمید صاحب سے ملاقات کی۔ جامعہ ہی میں خواجہ صاحب سے

ذاکر صاحب کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ انھیں جب پتہ چلا کہ ذاکر صاحب رخت سفر باندھ رہے ہیں تو وہ بھی رخصت کرنے کے لئے بمبئی تک آ گئے ۔ یہ ستمبر ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے۔
دونوں نے کرافرڈ مارکیٹ کے قریب ایک ہوٹل میں جو ان دنوں شاہجہاں ہوٹل کے نام سے موسوم تھا، دو بڑے کمرے ، پانچ روپے فی یوم کے حساب سے بک کرائے اور جہاز کی روانگی کی تاریخ تک اسی ہوٹل میں رہے ، ہوٹل کا منیجر ایک نہایت بداخلاق اور ترش رو آدمی تھا۔ اس کی ہدایت تھی کہ رات کے ۹ بجے کے بعد تمام کمروں کی روشنی گل کر دی جائے۔ ذاکر صاحب ، اور خواجہ صاحب دونوں ہی راتوں میں مطالعہ کے عادی تھے ان کے لئے یہ پابندی ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ انھوں نے منیجر کی بات نہ مانی۔ اور ایک بڑا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ خواجہ صاحب منیجر سے الجھ گئے۔ لیکن معاملہ دو مہروں کے بیچ بچاؤ سے رفع دفع ہو گیا۔ خواجہ صاحب قدرے جذباتی واقع ہوئے تھے ۔ ایسے موقعوں پر چپ ہو جانا یا طرح دیدینا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ انھوں نے ایک اور موقعہ پر ایک انگریز صاحب بہادر کی بھی مرمت کی تھی جو آگرہ جانے والی ایک ٹرین کے ڈبہ میں داخل ہونے پر سخت برہم ہو گیا تھا۔ اور انھیں ڈبہ کے باہر پھینک دینے کی دھمکی دی تھی۔ ٹرین کے اس یادگار سفر میں بھی سلیم الطبع ذاکر صاحب خواجہ صاحب کے ہمسفر تھے
بمبئی میں کچھ روز قیام کے بعد وہ بحری جہاز سے لندن روانہ ہو گئے۔
لیکن لندن کی درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنا چونکہ ان کے مخالف برطانوی سیاسی انداز فکر کے منافی تھا۔ اس لئے وہ جہاز کے اٹلی پہونچنے پر اتر پڑے ۔ اور وہاں سے انہوں نے آسٹریا کی راہ لی۔ یہاں جرمن سفارت گھر سے انھوں نے جرمنی کا ٹرانزٹ ویزا حاصل کیا اور برلن پہونچ گئے۔ سروجنی دیوی کے بڑے بھائی ویریندر ناتھ چٹوپادھیا ان دنوں جرمنی ہی میں تھے۔ انہوں نے ذاکر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ برلن یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف فارنرس میں شریک ہو جائیں۔ ذاکر صاحب نے ان کا مشورہ قبول کر لیا اور ویزا کے دو مہینوں کی مدت کے اختتام پر انہوں نے اسی یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی کورس

میں داخلہ لیا۔ دیریندرناتھ چٹوپادھیا بیرونی ممالک میں ہندوستان کی آزادی کے لیے سرگرم عمل انقلابیوں کے ہراول دستے میں شامل تھے ۔ مئی ۱۹۱۷ء ہی سے وہ اس بات کے کوشاں تھے کہ انقلاب روس کے رہنما لینن سے ربط پیدا کریں ۔ ۱۹۲۰ء میں زائغ العقیدہ کمیونسٹ بن گئے فروری ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے ہندوستانی انقلابیوں ہی پر نہیں بلکہ نیشلسٹوں پر بھی گہرا اثر چھوڑا تھا۔ چنانچہ مدراس کی ہوم رول تحریک کے لیڈروں کی جانب سے انقلاب روس کے بارے میں ایک کتابچہ کی اجرائی بھی عمل میں آئی تھی جس کا ایک پیراگراف یہ تھا۔

"نہ صرف ہندستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کو بلکہ عوام
کو بھی یہ جاننا چاہیے کہ روس کے پسماندہ اور بچھڑے
ہوئے طبقات نے اپنے اتحاد اور اپنی جدوجہد
سے دنیا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے
روس کے مزدوروں اور کسانوں کی حوصلہ مندی
ہندستان میں آزادی کے متوالوں کے لئے بھی سرچشمۂ
وجدان بن سکتی ہے۔"

اس صورت حال نے برطانوی سامراج اور اس کے ایجنٹوں کو بدحواس کر دیا تھا جس کا ثبوت برطانوی سفیر برائے اسٹاکہوم کے ایک کیبل سے ملتا ہے جو نیشنل ارکیوز میں دھری ہوئی وزارت داخلہ کی فائیل نمبر ۱۸۹۵ میں شامل ہے ۔ ۲۴ مئی ۱۹۱۰ء کے اس کیبل میں دیریندرناتھ چٹوپادھیا کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

"اخبارات میں برلن سے بعض ہندستانی نیشلسٹوں کے
دیریندر چٹوپادھیا کی زیر قیادت اسٹاکہوم پہونچنے کی
خبر ملی ہے اور چٹوپادھیا کا ایک انٹرویو بھی شائع
ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ انھیں امن کے
پروپگنڈے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بلکہ وہ ہندستان

کے لئے حکومت خود اختیاری، اور برطانوی تسلط سے
نجات کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ معتبر ذرائع سے
معلوم ہوا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں لیستن کی امداد و اعانت
کے حصول کی فکر میں ہیں ــــــ"

جرمنی میں ہندستان کا یہی شہرہ آفاق انقلابی ذاکر صاحب کا شیر تھا۔ اپنی قابل فخر بہن سروجنی دیوی کے وطن عزیز حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے اس نوجوان سے یوں بھی ویریندر ناتھ چٹوپادھیاکی دلچسپی اور ہمدردی بالکل فطری تھی۔ ان کے علاوہ جرمنی میں دوسرے کئی ہندستانی بھی موجود تھے عابد حسین بھی برلن یونیورسٹی ہی میں زیر تعلیم تھے جن سے ذاکر صاحب کا تعارف ان کے اور رشید احمد صدیقی کے مشترکہ کمرہ میں ہو چکا تھا ذاکر صاحب پر عابد حسین نے پہلی ہی ملاقات میں گہرا نقش چھوڑا تھا کچھ دنوں بعد تو خود خواجہ عبدالحمید بھی آ گئے۔ پروفیسر مجیب بھی آکسفورڈ سے جہاں وہ زیر تعلیم تھے چھٹیاں گذارنے کے لئے برلن پہونچ گئے۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں ذاکر صاحب کو علی گڈھ کالج کے لان پر ٹینس کھیلتے دیکھا تھا، اور اس وجیہہ بلند قامت، اور بارعب داڑھی والے نوجوان کی شخصیت سے کافی متاثر بھی ہوئے تھے۔ اب تو ذاکر صاحب کا لب و لہجہ کافی ذمہ دارانہ ہو گیا تھا۔ اور ٹینس کا شوقین کھلنڈرا نوجوان ادب فلسفہ اور سیاست کے مسائل پر بے تکان بولنے لگا تھا علی گڈھ نے ان کی شخصیت کو جو دلکشی، دلنوازی اور مقناطیست عطا کی تھی وہ برلن یونیورسٹی کی فضاء میں اور زیادہ اثر آفرین بن گئی تھی۔ پروفیسر مجیب نے محسوس کیا کہ ذاکر صاحب کا شعور ان کی عمر سے آگے نکل گیا ہے۔ اتنے سارے دوستوں اور شناساؤں کی موجودگی نے برلن یونیورسٹی کو بھی علی گڈھ کا روپ دیدیا اس مانوس ماحول میں ذاکر صاحب کی شخصیت اور زیادہ نکھر گئی۔ ہندستانی طلبہ ہفتہ میں ایک دن کسی جگہ بیٹھ کر ادب تعلیم اور سیاست کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا کرتے تھے ذاکر صاحب ایسی محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے ان محفلوں نے بالآخر "ہندستانی ایسوسی ایشن" کی شکل اختیار کرلی۔ ہندستانی طلبہ کی ایک بڑی اکثریت اس بات کی خواہشمند تھی کہ ذاکر صاحب اس انجمن کے صدر منتخب ہوں اگر ذاکر صاحب چناؤ میں

حصہ لیتے تو ان کا انتخاب یقینی تھا۔ لیکن ایسے طلبا کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے جنھوں نے ایک اور ہندستانی کو امیدوار نامزد کیا تھا اور جن کی تعداد بہت تھوڑی تھی صدر صاحب نے رضاکارانہ طور پر دستبرداری اختیار کر لی ۔۔۔ برلن یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ حائل تھا لیکن مسافت جامعہ سے ان کی محبت پر اثر انداز نہ ہو سکی پروفیسر مجیب اور عابد حسین کو انھوں نے جامعہ ملیہ کے جنم لینے کی کہانی سنائی اور اتنے دلنشیں اور دلگداز پیرایہ میں سنائی کہ ان دونوں کو بھی اس نئی درسگاہ سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس طرح ذاکر صاحب کے ساتھ یہ دونوں بھی جامعہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر بن گئے اور اس مشترکہ مرکز محبت نے تینوں کی دوستی کے رشتہ کو بہت زیادہ مستحکم و استوار کر دیا ۔۔۔ مجیب صاحب نے بڑے ہی جوش و خروش سے جامعہ کے لئے اپنی خدمات کا پیشکش کیا لیکن ذاکر صاحب نے ان کا دل ٹٹولنے کی کوشش کی۔ بولے! "آپ ٹھہرے امیر گھرانے کے فرد ہم بھلا آپ کی خدمت کا صلہ کہاں سے دے سکیں گے" یہ جملہ ذاکر صاحب نے اس خیال کے پیش نظر کہا تھا کہ پروفیسر مجیب کے دلی جذبات کے سمندر میں طوفان برپا کر دیں ۔۔۔ لیکن پروفیسر مجیب پر ذاکر صاحب کا یہ طنز قدرے گراں گذرا۔ انہوں نے کہا۔ کاش تم سمجھ سکتے کہ جامعہ کے لئے میرے دل میں کتنی جگہ نکل آئی ہے۔" ذاکر صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ وہ مدتوں سے جس شخص کی تلاش میں تھے وہ ان کے بازو بیٹھا ہے۔ فرط مسرت و محبت میں وہ مجیب صاحب سے بغلگیر ہو گئے۔ انہوں نے پروفیسر مجیب کو مشورہ دیا کہ وہ طباعت و اشاعت کی ٹکنک میں مہارت پیدا کریں۔ کیونکہ یہ بات جامعہ کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ذاکر صاحب نے اس اثناء میں برلن کے کاوانی پریس کے ارباب مجاز سے دوستی کر لی اور مکتبہ جامعہ اور جامعہ پبلشنگ ہاوز کے بارے میں انہیں وقتاً فوقتاً ضروری معلومات بھی فراہم کیا کرتے تھے۔ کاوانی پریس علوم مشرقیہ کی کتابوں کی اشاعت کا شہرہ آفاق مرکز تھا ذاکر صاحب نے اسی پریس میں دیوان غالبؔ کا ایک بیحد خوبصورت نسخہ چھپوایا۔ انہوں نے اس کی کمپوزنگ میں کاوانی پریس کے کمپوزیٹروں کا ہاتھ بھی بٹایا تھا۔ اس کی جلدیں انہوں نے

اشاعت کے لئے مکتبہ جامعہ روانہ کیں۔ جہاں وہ ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔

۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری یورپ کے دورہ پر آئے اور پیرس میں ذاکر صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی ذاکر صاحب نے انھیں یقین دلایا کہ، ہندستان کو واپس ہونے کے بعد وہ اپنے آپ کو جامعہ کے لئے وقف کر دیں گے ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جب ویانا پہونچے تو ذاکر صاحب کی ایما پر مجیب صاحب عابد حسین صاحب ، خواجہ عبدالحمید اور برکت علی قریشی نے ان سے وفد کی شکل میں ملاقات کی ان سب لوگوں نے عہد کیا کہ وہ جامعہ کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے ۔ ان دنوں ذاکر صاحب کا امتحان قریب تھا ، پڑھائی اور تیاری میں مشغول تھے اس لئے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری سے ملاقات نہ کر سکے جامعہ کے اتنے سارے ہمدردوں اور خدمتگذاروں کو دیکھ کر ان دونوں کو بڑا اطمنان ہوا۔

جرمنی میں ذاکر صاحب کی مصروفیات کا دائرہ وسیع سے وسیع ہوتا جا رہا تھا ستیلاپ ٹینی میں انہوں نے جو کمرہ لے رکھا تھا ، وہ ہندستانی طلبا کا ایک تہذیبی مرکز بن گیا کتنے ہی جرمن نوجوان ان کے حلقہ احباب میں شامل تھے ہر قسم کے لوگوں سے نباہ کرنے کی جس صلاحیت کی بنا پر وہ علی گڈھ میں مشہور تھے وہ جرمنی میں بھی اپنا رنگ جمانے لگی ذاکر صاحب کا محفل میں گرمجوشی سے خیر مقدم کیا جاتا ۔ لوگ ان کی ذہانت سے متاثر ہوتے ان کے اخلاق و آداب کی تعریف کیا کرتے ۔ جرمنی سے خواجہ غلام السیدین سے ملاقات کے لئے لیڈز پہونچے تو وہاں بھی ان کے گن گائے جانے لگے سویڈن کے ایک دوست پٹرسن کے ساتھ اسکینڈی نیویا کا دورہ کیا اور اسی دورہ میں دونوں قلاش ہو گئے ۔ ذاکر صاحب کو ایک نئی ترکیب سوجھی ۔ انھوں نے سویڈن کے ایک اخبار کے لئے گاندھی جی پر ایک مضمون لکھا ، اور اس مضمون کا خاطر خواہ معاوضہ مل گیا ۔ جرمنی میں قیام کے دوران انھوں نے مشہور جرمن مصنف الفریڈ رھنر نٹ رتیچ کو گاندھی جی پر ایک کتاب لکھنے میں مدد بھی دی اور اس تصنیف کو دونوں کی مشترکہ تخلیق کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ذاکر صاحب کے جرمنی کے دورہ کے بارے میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے لکھا ہے

"دو سال تک جامعہ ملیہ کی تعمیر میں مولانا محمد علی کا
ہاتھ بٹانے کے بعد ۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب معاشیات
کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے برلن پہونچے ۔ میری ملاقات
ان سے ایک مرتبہ علی گڈھ میں ہو چکی تھی لیکن اب
سوا تین برس تک ان کا میرا ساتھ رہا میں نے
انھیں ہر رنگ میں دیکھا اور ہر رنگ میں جو کھا
پایا۔ سب سے زیادہ مجھ پر اس بات کا سکہ بیٹھا کہ ذاکر
صاحب "در ایام جوانی چناں کہ افتد دانی" کی وادی
پرخار سے بڑی پامردی سے گذرے ۔ گھبرا کر
بھاگنے کی کوشش میں کانٹوں سے الجھے نہیں
بلکہ اوسان قائم رکھے دامن بچائے قدم بڑھائے
چلے گئے ۔ برلن میں ذاکر صاحب کے استادوں میں
پروفیسر زومبارٹ ، اور دوسرے بڑے پائے
کے عالم تھے جن سے انہوں نے بہت فیض
اٹھایا مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کسی سے پایا
تو میرے استاد اسپرانگر سے جو صبر کے ساتھ نظر
بھی رکھتے تھے ۔"

ذاکر صاحب کی فکر و نظر کو بھی جرمنی کے صاحبانِ فکر و نظر نے جلا ضرور دی ۔ لیکن اس دور کے ان مغرب زدہ کرم فرماؤں سے ذاکر صاحب اور ان کے برلن یونیورسٹی کے ہم جماعت قطعاً مختلف تھے جن کے بگڑے خدوخال کلیات اکبر میں نظر آتے ہیں ذاکر صاحب کے دل میں ہندستان کی آزادی کی چنگاری سلگ اٹھی تھی برلن یونیورسٹی نے

اسے ایک شعلہ جوالہ کی شکل دیدی۔ جو زمین ہندستانی تہذیب کی اتھاہ گہرائیوں تک پہونچنا چاہتا تھا۔" زومبارٹ" اور" اشیرانگر" نے افکار تازہ کی مہک سے بھی روشناس کرایا

جرمنی میں ذاکر صاحب کے لیل و نہار ایران کی معروفیات کا تذکرہ خالدہ ادیب خانم نے کیا ہے۔ ذاکر صاحب میونخ میں چھٹیاں گذار رہے تھے کہ ایک دن خالدہ ادیب خانم سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ خالدہ کے الفاظ میں، ذاکر صاحب عنفوان شباب کے اس دور ہی میں" باریش بروست مقطع بزرگ" بن گئے تھے اور اس بظاہر پختہ کار ہندستانی نوجوان کے ساتھ ایک اور ہندستانی طالب علم بھی تھا۔ عجیب ..... ذاکر صاحب سے بالکل مختلف، دل آویز خط و خال، سوچتی ہوئی آنکھیں صورت شکل ہی سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن داخلی حیثیت سے وہ بھی اپنے بظاہر بزرگ ساتھی کی طرح سنجیدہ اور متین واقع ہوا تھا۔ خالدہ ادیب خانم آگے چل کر لکھتی ہیں" میں تو اب تک باتونی ہندستانی طلبا سے ملتی رہی تھی۔ لیکن اس دفعہ ہندستان کی نئی نسل کا ایک مختلف نمونہ میرے سامنے تھا۔ بالکل مختلف اور بالکل بدلا ہوا۔"

جرمنی میں ذاکر صاحب کا تعارف مس گرڈا فلپس بورن سے ہوا جو بعد میں جامعہ کی خدمت گذار بن گئیں اور اپنی آخری سانسوں تک جامعہ سے وابستہ اور منسلک رہیں مس فلپس بورن اپنے عہد کے لڑکوں اور لڑکیوں سے جداگانہ شخصیت کی حامل تھیں ان کا تعلق ایک مشہور علم دوست خاندان سے تھا۔ اس سیماب صفت خاتون کے لئے موسیقی روح کی غذا تھی اور آرکسٹرا کے مشہور کنڈکٹر برونو والٹر فلپس بورن کے گہرے دوست تھے۔ لیکن موسیقی سے زیادہ مس فلپس بورن کو ان تحریکوں سے دلچسپی تھی جن کا مقصد انسانی برادری کو مصائب و آلام، افلاس و جہالت سے نجات دلانا ہے۔

برلن میں پناہ گزین یہودی بچوں کے کیمپ میں ان کا سارا وقت گذرتا۔ وہ سڑکوں پہ گھوم پھر کر ان بچوں کے لئے چندے جمع کرتیں۔ ذی ثروت لوگوں سے

کیمپ کے لئے فرنیچر کے عطیئے حاصل کرتیں ۔ اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ کیمپ کے لئے دی ہوئی کسی صاحب خیر کی کرسی اٹھائے چلی آرہی ہیں ۔ ہندستان کی تحریک آزادی سے بھی فلپس بورن کو گہری دلچسپی تھی ۔ اور اسی دلچسپی نے انھیں برلن میں زیر تعلیم ہندستانی طلبا سے قریب تر کر دیا تھا ۔ ذاکر صاحب ، مجیب صاحب ، اور عابد حسین صاحب کی ان سے پہلی ملاقات ، سروجنی دیوی کی چھوٹی بہن مسز ننبیار کی قیام گاہ پر ہوئی جو جرمنی کی مہذب شائستہ اور دردمند شخصیتوں سے ہندستانی طلباء کی ملاقات کا انتظام کیا کرتی تھیں۔ اس کے بعد یہ تینوں پابندی سے فلپس بورن سے ملنے لگے ۔

ذاکر صاحب نے انھیں بھی جامعہ کی کہانی سنائی اور اتنے پُراثر انداز میں کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں ۔ چنانچہ برلن ہی میں انہوں نے جامعہ کے لئے کام کرنا شروع کر دیا ۔ ذاکر صاحب کو اس وقت اس کا گمان تک نہ تھا کہ فلپس بورن کسی دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جامعہ چلی آئیں گی ۔ اور اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دینگی ذاکر صاحب نے ان کا تعارف خواجہ عبدالحمید سے بھی کرایا اور چند ہی دنوں میں وہ ذاکر صاحب کے خصوصی حلقہ احباب میں شامل ہو گئیں ۔

اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس اثنا میں ذاکر صاحب نے مغربی موسیقی سیکھ لی تھی ۔ اور مس فلپس بورن نے انھیں مغربی کلاسیکی موسیقی کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا اہل بنا دیا تھا ۔ برونو والٹر اپنے ہر پروگرام کے موقع پر فلپس بورن کو دو ٹکٹ بھیجا کرتے تھے اور وہ ہر پروگرام میں ذاکر حسین صاحب کو لیجایا کرتی تھیں ۔ ان محفلوں میں ذاکر صاحب کو جرمنی کے کئی باکمال فن کاروں ادیبوں اور دانشوروں سے قریب ہونے کا موقع ملا ۔

جرمنی کی درس گاہوں کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ ہندستانی طلبار کافی ذہین واقع ہوئے ہیں وہ ان کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آنے لگے اور خود ہندستانی طلباء نے روایتی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے کافی اکتساب فیض کیا

۱۹۲۶ء میں ہندستانی طلباء نے اپنے جرمن اساتذہ کی محبت و شفقت کے اعتراف میں برسٹل ہوٹل میں ایک بڑی تقریب منعقد کی۔ اور اس موقع پہ ذاکر صاحب نے خیر مقدمی تقریر کی۔ نوبل انعام یافتہ شاعر پروفیسر ھیبیر نے جرمن اساتذہ کی جانب سے ان کی خیر مقدمی تقریر کا جواب دیا۔ ان مصروفیات کے باوجود ذاکر صاحب نے تعلیم کے تعلق سے کوئی تجاہل یا تساہل روا نہ رکھا۔ وہ ان دنوں معاشیات سے پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے تھے اس سلسلے میں انھیں پروفیسر زومبارٹ سے کافی مدد ملی۔ دوسری طرف ماہر تعلیم اشپرانگر، اور کرسچین ٹیبتر نے انھیں درس و تدریس کے رموز و نکات سے روشناس کرایا۔ مجیب اور عابد حسین نے اپنے نصاب کی تکمیل کرلی لیکن وہ ذاکر صاحب کے امتحان کے اختتام کے منتظر تھے۔ بالآخر ذاکر صاحب نے برلن یونیورسٹی سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اور پھر وہ دن بھی آپہنچا جب کہ انھیں وطن کی واپسی کی تیاری کرنی پڑی۔ مس فلپس بورن، خواجہ عبدالحمید ایک خوبصورت لڑکی لوما جو بعد میں مسز حمید بن گئیں برلن سے سوئیزرلینڈ روانہ ہوئے۔ اور سوئیزرلینڈ سے اٹلی کی سرحد میں داخل ہوئے، اور وہاں سے بحری جہاز ڈفرنگر کے ذریعہ کولمبو پہنچے کولمبو سے دھنش کوڈی۔ اور پھر مدراس، مادر وطن اپنے ان جلیل القدر فرزندوں کے لیئے بانہیں کھولے کھڑی تھی۔

پھر وہی جامعہ

ذاکر صاحب واپس ہوئے تو جامعہ کا رنگ روپ ہی بدل گیا تھا مالی حیثیت سے اس کی حالت بہت سقیم ہوگئی تھی خلافت کمیٹی نے صرف اتنی رقم دی تھی کہ اس کے ایک سال کے اخراجات کی پابجائی ہو جائے اور اب یہ سوال منہ پھاڑے کھڑا تھا کہ جامعہ کو چلانے کے لیئے ضروری اخراجات کی کیا سبیل نکالی جائے۔ اس کے ہمدردوں کی اکثریت بھی اس تعلق سے بے نیازی برتنے لگی تھی۔ نہ کوئی ذریعہ، نہ کوئی

وسیلہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جامعہ اب کچھ ہی دنوں کی مہمان ہے اس صورت حال نے اس کے بانیوں میں بھی مایوسی کی لہریں دوڑادی تھی۔

ستمبر ۱۹۲۳ء میں جب مولانا محمد علی جیل سے رہا ہوئے تو طلبائے جامعہ نے ان کے استقبال میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی نے طلباء کی جانب سے مولانا کا خیر مقدم کرتے ہوئے جامعہ کی حالت زار کے تعلق سے غالب کا مشہور شعر پڑھا

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اور مولانا نے اپنی جوابی تقریر میں کہا ـــ " میں نے کسی وقت بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ جامعہ کو ایک مستقل ادارہ کی شکل دی جائے گی۔ جامعہ کا وجود مجھے مدینہ کے ان مہاجرین کی یاد دلاتا ہے جو فتح مکہ کی امید میں دن گذار رہے تھے۔ ہمارا مقصد تو علی گڑھ کو فتح کرنا ہے۔ اور ایک نہ ایک دن اس کی تکمیل ہوگی ـــ "

مولانا محمد علی کے ان ارشادات نے دردمندان جامعہ کو خواب سے چونکا دیا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ مولانا کا یہ انداز فکر جامعہ کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ جامعہ کے عالم وجود میں آنے کے ایک ماہ بعد ہی خود خلافت کمیٹی نے طے کیا تھا کہ جامعہ کو ایک ایسے خود مختار تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے باقی و برقرار رکھنا چاہیئے جو بیرونی کنٹرول اور تسلط سے بالکل آزاد ہو۔ دو سال بعد ڈاکٹر انصاری نے جامعہ کے لئے چندوں کی اپیل جاری کی تھی اور اسے جامعہ کی بقاء کے سلسلہ میں ایک اہم اقدام کے مترادف قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے اوائل ہی میں جامعہ پر خلافت کمیٹی کا اثر کم ہونے لگا۔ سیاسی جوش و خروش بھی ٹھنڈا پڑتا جارہا تھا اور خلافت تحریک کی یادیں باقی رہ گئی تھیں۔ وہ تمام سیاسی شخصیتیں جنہوں نے جامعہ کی تاسیس میں بڑے ہی حوصلہ اور ہمت کا مظاہرہ کیا تھا وہ انجان بن گئے تھے اور ان میں اکثر مولانا محمد علی کے ہم خیال تھے کہ جامعہ کو ایک مستقل ادارہ کی شکل نہیں دی جانی چاہیئے۔ لیکن کچھ ایسے دیوانے بھی تھے جن کے لئے جامعہ کی

برخاستگی خود اپنی موت کے مترادف تھی۔ اسی کسمپرسی کے عالم میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو جو ابھی جرمنی سے واپس نہیں ہوئے تھے ایک کیبل روانہ کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح جامعہ کی برخاستگی کا ذکر کھلے عام کیا جارہا ہے اس کے ساتھ یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ اس معاملہ میں ان کی کیا رائے ہے؟ توقع کے مطابق کیبل کا فوری جواب ملا، "میں اور میرے دوست اپنی ساری زندگی جامعہ کے لئے وقف کر دینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ براہ کرم ہماری واپسی تک اسے بند نہ ہونے دیجئے۔"

اس اثناء میں جامعہ کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا اور جامعہ کے طلباء کے ایک وفد نے دہلی میں حکیم اجمل خاں سے مل کر ان سے درخواست کی کہ وہ جامعہ کی بقاء اور برقراری کی کوئی سبیل نکالیں۔ ان طلباء نے حکیم صاحب کو یقین دلایا کہ وہ جامعہ کی بقاء کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے پر آمادہ ہیں حکیم صاحب نے اس وفد سے پوچھا کہ کیا انھیں جامعہ کی علی گڈھ سے دہلی کو منتقلی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وفد نے بتایا کہ انھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور وہ کسی معاوضہ کے بغیر جامعہ کی خدمت کریں گے ـــــ حکیم صاحب نے وفد کے ارکان کے پختہ ارادوں کا اندازہ کر لیا اور مجلس عاملہ میں یہ تجویز پیش کی۔ کافی بحث و مباحث کے بعد عاملہ نے جامعہ کی دہلی کو منتقلی کی اجازت دیدی۔ حکیم صاحب نے جن کی فراخ حوصلگی کا بڑا شہرہ تھا جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ اس پر آشوب اور بحرانی دور میں گاندھی جی واحد شخصیت تھے، جو جامعہ کو باقی و برقرار رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے رہے۔ حکیم اجمل خاں نے ایک دفعہ گاندھی جی سے جامعہ ملیہ کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے اس کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ اور انھیں بتایا کہ جامعہ کے بانیوں میں بھی کس طرح اختلاف خیال پیدا ہو گیا ہے۔ گاندھی جی نے حکیم صاحب سے کہا کہ جامعہ کی بقاء کے لئے اگر روپیہ درکار ہے تو مجھے بھیک مانگنے سے بھی کوئی عار نہ ہوگا۔ گاندھی جی کی جامعہ سے اس درجہ وابستگی حکیم صاحب کے لئے حوصلہ افزای

ثابت ہوئی اور انہوں نے بھی تہیہ کر لیا کہ وہ جامعہ کو کبھی بند نہ ہونے دیں گے اسی اثنا میں جامعہ کی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کو حکیم صاحب کی دہلی کی قیام گاہ شریف منزل میں منعقد ہوا۔ اور اسی میں ایک سب کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ وہ ضروری چھان بین کے بعد فاونڈیشن کمیٹی کو مطلع کرے کہ کیا جامعہ کو باقی و برقرار رکھا جا سکتا ہے یا نہیں یہ سب کمیٹی حکیم اجمل خاں کے علاوہ، علی برادران، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور اس وقت کے شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ پر مشتمل تھی۔۔۔ دوسرے دن بھی فاونڈیشن کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا اور اس جلسہ میں گاندھی جی نے بھی شرکت کی اس میں طے پایا کہ جامعہ کو بہر صورت باقی و برقرار رکھا جانا چاہیئے۔ اجلاس میں اس کی بقاء کے لئے ضروری وسائل مہیا کرنے کی تجاویز پر بھی غور کیا گیا۔۔۔ ۷ مارچ ۱۹۲۵ء کو فاونڈیشن کمیٹی کا ایک اور اجلاس طلب کیا گیا، اور اس میں جامعہ کی علی گڈھ سے دہلی کو منتقلی کے فیصلہ کی توثیق کی گئی۔۔۔

یہ فیصلہ نہایت معقول اور مناسب تھا۔ مولانا محمد علی اور دیگر بانیوں کے انداز فکر نے جامعہ کو علی گڈھ کی پرچھائیوں کا روپ دیدیا تھا اور ظاہر ہے کہ جامعہ کی علی گڈھ سے منتقلی کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے ایک خود اختیار تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا اور اس کی بقاء اور برقراری کا انحصار علی گڈھ پر نہیں لیکن اس فیصلہ نے کئی اور مسائل کھڑے کر دیئے۔ جوں جوں جامعہ کی منتقلی کے دن قریب آنے لگے۔ وابستگان جامعہ کے لیے علیگڈھ سے جدائی سوہان روح بننے لگی۔ کھلے صحن میں جماعتوں کا انعقاد، ورزش، معین الحجاج کی اذان۔ دہلی میں یہ سب نعمتیں کہاں نصیب ہونگیں۔ طلباء اور اساتذہ بجھ سے گئے تھے لیکن جامعہ کی بقاء کے لیے منتقلی ناگزیر تھی، اس لئے علی گڈھ سے یہ جب جدائی کا درد گوارا کر لیا گیا۔ بعض طلباء نے انفرادی مجبوریوں کے تحت علی گڈھ نہ چھوڑا۔ لیکن بڑی اکثریت دہلی چلی آئی۔۔۔

ابتدائی دور کی دشواریوں پر ہمت اور حوصلہ سے قابو پالیا گیا اور بتدریج طلباء کی تعداد بڑھنے لگی۔ مولانا محمد علی نے جلد ہی اپنے نقطۂ نظر کو جامعہ کے نئے حالات سے ہم آہنگ کر لیا اور وہ بھی جامعہ کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے لگے اب تو وہ اساتذہ اور طلباء

دونوں ہی سے ان کی دشواریوں پر تبادلہ خیال کرنے لگے، ہمت اور حوصلہ اور امید کے اسی دور میں ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے دونوں دوستوں، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ دہلی واپس ہوئے۔ جامعہ کے طلباء اور اساتذہ نے ان کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا، ان کی آمد کی مسرت میں جامعہ کے رسالہ "جوہر" کا خصوصی نمبر شائع کیا گیا۔ ذاکر صاحب کو شیخ الجامعہ مقرر کیا گیا۔ اور اسی دن سے ذاکر صاحب کی زندگی جامعہ کی زندگی بن گئی۔ مجیب صاحب کو تاریخ کا پروفیسر بنایا گیا۔ ڈاکٹر عابد حسین کو درس و تدریس کے علاوہ "جوہر" کی ادارت کی زائد ذمہ داریاں بھی قبول کرنی پڑیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ جامعہ ملیہ قرول باغ میں کرایہ پر لی ہوئی ایک عمارت میں تھی۔ اس کے چلانے والوں اور ارباب مجاز کو ہر روز ایک نئی الجھن سے دوچار ہونا پڑتا لیکن ان کی جبین پر شکن تک نہ آتی وہ عزم اور استقلال سے ہر افتاد سے نمٹتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے جامعہ کی چھٹی سالگرہ آپہونچی۔ اور اس موقع پر ڈاکٹر انصاری نے اعلان کیا کہ جامعہ ایک تعلیمی ادارہ ہے اور اسے ہر قسم کی تنگ نظری سے محفوظ رکھنا ہمارا اولین فریضہ ہے ــــ یوں بھی نامساعد اور ناموافق حالات کے باوجود یہ قومی تعلیمی ادارہ جسے تحریک عدم تعاون نے جنم دیا تھا صائب الرائے حلقوں کا مرکز نظر بن گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت کے صدر کانگریس مسٹر سرینواس آئنگار نے جامعہ کے تفصیلی معائینہ کے بعد طلباء اور اساتذہ کے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

> "دوسرے قومی تعلیمی ادارے بے روح اور بے جان
> ہو گئے ہیں، جامعہ تو جوش و خروش، حوصلہ مندی کے
> مظاہروں کا مرکز بنی ہوئی ہے اور یہ بات کچھ کم باعث
> مسرت نہیں ــــ میری دعا ہے کہ یہ ادارہ ترقی کے
> منازل تیزی سے طے کرے ــــ"

جامعہ کی انفرادیت اور شہرت ہندستان آنے والے بیرونی صاحبان نظر کو بھی کشاں کشاں

اس کے احاطہ میں کھینچ لاتی، لیکن روپیہ اور سرمایہ کی فراہمی کا مسئلہ اب بھی ارباب جامعہ کے لئے درد سر بنا ہوا تھا۔ پروفیسر مجیب نے جامعہ کی صورت حال کے تفصیلی تجزیہ کے بعد کہا کہ "لوگ ایسے کسی ادارہ کی مالی مدد میں تامل کرتے ہیں جو فلاکت و غربت کا شکار رہو یا پھر جو بہت زیادہ متمول اور خوشحال نظر آئے غربت و فلاکت کے شکار کسی ادارہ کی مالی امداد کو وہ بے فیض اور متمول ادارہ کی اعانت کو غیر ضروری تصور کرتے ہیں جامعہ کیلئے حصول سرمایہ کی ایک صورت یہی ہے کہ وہ اپنی تدریسی تکنک میں انفرادیت پیدا کرے ۔

جامعہ کے اساتذہ مختلف مکاتب خیال کے حامل تھے۔ عربی اور دینیات کے معلم کا حال یہ تھا کہ انھوں نے "گناہ نظر" کے اندیشہ کے تحت سروجنی دیوی کو نظر بھر دیکھنا قبول نہ کیا۔ مصافحہ کے لئے آگے بڑھے ہوئے بیگم بھوپال کے ہاتھ کو انھوں نے یہ کہکر جھٹک دیا کہ کسی اجنبی خاتون کے ہاتھوں کا لمس ان کے لئے شجر ممنوعہ تھا ۔ دوسرا گروہ نشنلزم سے متاثر تھا۔ لیکن اس کا مذہبی رنگ اُسے قطعاً پسند نہیں تھا۔ جو لوگ مذہبی رنگ کے دلدادہ و شیدا تھے وہ نیشنلزم کا نام سن کر تیوریاں چڑھاتے ۔ ذاکر صاحب کو اس اجتماع ضدین میں انتہائی صبر و تحمل سے کام کرنا پڑتا۔ انھیں ایک ہی فکر تھی کہ جامعہ کسی طرح باقی و برقرار رہے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ اس کے پرائمری اسکول کو نمونہ کی درس گاہ بنانا چاہتے تھے اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے بچوں کی تعلیم کے ماہر عبدالغفار مدھولی کو اس کا صدر مقرر کیا۔ وہ نظم و ضبط کے اس درجہ پابند تھے کہ جب ذاکر صاحب ایک جلسہ میں کچھ دیر سے پہونچے تو انہوں نے ان کی بجائے ایک اور بزرگوار کو مسند صدارت پر لا بٹھایا تاکہ جلسہ اعلان کردہ وقت پر شروع ہو جائے ذاکر صاحب نے ناراض ہونے کے بجائے مدھولی صاحب کی ستائش کی ۔ اور حاضرین جلسہ سے کہا کہ وہ ان سے ڈسپلن کی پابندی کا سبق سیکھیں ۔ شیخ الجامعہ کے عہدہ پر فائز رہنے کے باوجود ذاکر صاحب نے حلم و انکسار کی روایت میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ایک دفعہ ثانوی جماعتوں کے ایک استاد سے خواہش کی گئی کہ وہ پرائمری جماعتوں کے لئے بھی ایک گھنٹہ دیں۔ استاد محترم پر یہ بات بڑی گراں گذری، اور انھوں نے پرائمری جماعتوں کو پڑھانے

سے انکار کردیا۔ ذاکر صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے پہلی جماعت کی ذمہ داری قبول کرلی۔ وہ اچانک "ڈائننگ ہال" میں پہونچ جاتے اور طلباء کے ہم طعام بن جاتے غلاظت اور گندگی کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ کلاس میں داخل ہوکر انہوں نے اپنی اچکن کی جیبوں سے کپڑے کی دھجیاں، کاغذ کے پرزے اور اس قسم کی دوسری چیزیں نکال کر میز پر رکھدیں اور کہا میں نے اپنے کمرے سے آپ کی کلاس کو آتے ہوئے راستہ میں یہ سارا کوڑا کرکٹ پڑا پایا۔ درس گاہ تو عبادت گاہ ہوتی ہے۔ اسے آئینہ کی طرح پاک و صاف رہنا چاہیئے۔ ہفتہ میں دو تین مرتبہ وہ ہاسٹل کے طعام خانہ کا معائنہ کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے باورچی کو ہدایت دی کہ وہ طعام خانے کے شیشہ کے دریچوں کو ہر روز صاف کرے، دوسری مرتبہ وہ معائنہ کو گئے تو انھوں نے شیشہ کے دریچہ پر حسب معمول دھوئیں اور گرد کی تہہ جمی دیکھی غصہ میں آکر انہوں نے مکہ مار کر دریچہ توڑدیا اور اس میں خود ان کا ہاتھ بھی لہولہان ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد کسی نے دھوئیں اور گرد کی تہہ نہیں دیکھی۔

ذاکر صاحب تعلیمی اسکیموں کے لئے چندے اور عطیئے جمع کرنے کی تکنک کے ماہر تھے۔ چنانچہ انھوں نے جامعہ کے بحرانی دور میں اس تکنک سے کام لیا۔ اور جامعہ کے لئے ان کی مساعی سے کافی سرمایہ اکھٹا ہوگیا۔ تھیلیوں کی وصولی کی مہم ہی پر وہ حیدرآباد بھی آئے تھے اور ان کا یہ دورہ بیحد کامیاب رہا۔ انھوں نے حیدرآباد کے ارباب فکر و نظر کو بھی جامعہ کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرایا اور ان کے دل میں جامعہ کے لئے نرم گوشہ پیدا کردیا۔ جامعہ کے خدمت گذاروں کے دائرہ کو وسعت دینے کی مہم میں بھی ذاکر صاحب کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور جی راجندرن کے علاوہ دیوداس گاندھی بھی جامعہ کے علمی ہمدردوں اور خدمت گذاروں کے زمرہ میں شامل ہوگئے۔ جامعہ کے لئے گاندھی جی کی ہمدردی سب سے بڑا اثاثہ ثابت ہوئی۔ اس درس گاہ کی دہلی کو منتقلی کے بعد جب پہلی مرتبہ جامعہ آئے تو علی برادران حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری

جمنالال بجاج اور مہادیو دیسائی بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس دفعہ گاندھی جی جامعہ کے جدید طریقہ تعلیم سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے پوتے رسک لال کو بھی اس کا طالب علم بنا دیا۔

کچھ ہی دنوں بعد جامعہ کو حکیم اجمل خاں کی رحلت کا سانحہ پیش آیا۔ ذاکر صاحب کے لئے وہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھے۔ امتحان و آزمائش کے ہر مرحلہ پر ذاکر صاحب ان ہی سے رجوع کرتے تھے، اور ان کی مشاورت بہرحال سودمند ثابت ہوتی حکیم صاحب دیگر سیاسی قائدین کے برعکس نوجوانوں کے ساتھ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آیا کرتے تھے۔ انھوں نے جامعہ کو باقی اور برقرار رکھنے کے لئے جو قربانیاں دی تھیں ان سے بہت کم لوگ واقف تھے لیکن ذاکر صاحب جانتے تھے کہ حکیم صاحب کا اٹھ جانا جامعہ کے لئے کتنا بڑا، اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ جامعہ کا قرض چکانے کے لئے حکیم صاحب نے اپنی جائداد کا ایک حصہ اونے پونے فروخت کر دیا تھا۔

حکیم صاحب کے بعض دوستوں نے ان کی وفات کے بعد ان کی موزوں یادگار کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اور ان کے بعض دوستوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جامعہ ہی حکیم صاحب کی موزوں یادگار ہے۔ اور اس کی حالت کو بہتر بنانا ہی ان کی یاد تازہ رکھنے کے مترادف ہوگا۔ فروری ۱۹۲۸ء میں حکیم صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ کانگریس کے سالانہ اجلاسوں کو چھوڑ کر ہندستان میں اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت مسٹر نہرو کے والد محترم موتی لال نہرو نے کی۔ اس کے قابل ذکر شرکاء ہیں، مسٹر جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مسٹر سرینواس آینگار، ڈاکٹر انصاری، سروجنی دیوی راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر وجئے راگھو چاریہ، مسٹر ٹی پرکاشم، لالہ شنکر لال اور ایس ایم عالم شامل تھے ڈاکٹر انصاری نے اس جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے حکیم صاحب مرحوم کی قومی خدمات کی تفصیل گنوائی، اور یہ تجویز پیش کی کہ ان کی یادگار کے طور پر ۸ لاکھ روپے کی لاگت سے جامعہ کی مستقل عمارت تعمیر کروائی جائے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، مولانا ابوالکلام

آزاد، اور دیگر قائدین نے ڈاکٹر انصاری کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور شرکا ء جلسہ نے بھی ان کی اس تجویز کی منظوری دیدی ۔ جامعہ کے استحکام کے لئے ذاکر صاحب پروفیسر مجیب، اور جناب عابد حسین نے اپنی قلیل ترین تنخواہ میں رضاکارانہ طور پر کمی کا پیش کش کیا۔ ابتداء میں ان تینوں کو ماہانہ ۳۰۰ روپے ملا کرتے تھے اور بعد میں خود انھیں کی خواہش پر ان کا مشاہرہ گھٹا کر ۲۰۰ روپے کردیا گیا۔ اور پھر ۱۵۰ روپے! ذاکر صاحب نے ۱۹۴۸ء میں جامعہ کی ملازمت ترک کی تو انھیں ماہانہ ۹۵ روپے ملا کرتے تھے ۔!!

حکیم اجمل خاں کی وفات کے بعد ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے چانسلر (امیر جامعہ) مقرر ہوئے، وہ نواب صاحب بھوپال کے معالج خصوصی تھے ۔ چنانچہ اپنے ذاتی اثر سے کام لیکر انھوں نے نواب صاحب کو جامعہ کی مالی امداد پر آمادہ کرلیا ۔ لیکن نواب صاحب نے مالی امداد کی اجرائی کے لئے یہ شرط عائد کردی کہ جامعہ ملیہ کو سیاست سے الگ تھلگ اور بے تعلق رکھا جائے اگرچہ جامعہ ملیہ کا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے باوجود ذاکر صاحب نے مشروط امداد قبول کرنے سے انکار کردیا ۔ کیونکہ یہ بات ان کے اصولوں کے خلاف پڑتی تھی ۔ ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے مل کر انھیں اپنے فیصلہ سے واقف کرایا۔ گاندھی جی نے اس مسئلہ پر ڈاکٹر انصاری سے بات چیت کی ۔ ڈاکٹر صاحب نہیں چاہتے تھے کہ گاندھی جی کو نواب صاحب بھوپال کے امداد کے مشروط پیش کش سے واقف کرایا جائے مگر جب انھیں گاندھی جی سے پتہ چلا کہ ذاکر صاحب اس مسئلہ پر تبادلہ خیال، کر چکے ہیں تو وہ ذاکر صاحب سے ناراض ہو گئے ۔ گاندھی جی اس دوران جامعہ کی امداد کے لئے اپیلوں پر اپیل جاری کرتے رہے، لیکن اُس کا کوئی اثر نہ ہوا آخر جمنالال بجاج نے جو جامعہ کے خازن تھے یہ تجویز پیش کی کہ جامعہ کا نام بدل کر جامعہ اجملیہ رکھا جائے اور اسلامیہ کا جزو اس سے حذف کردیا جائے ۔ ذاکر صاحب نے مسٹر بجاج کی یہ تجویز بھی مسترد کردی اور گاندھی جی نے اس سلسلہ میں ذاکر صاحب کے نقطہ نظر کی بھرپور

تائید کی۔ لیکن ان دونوں تجاویز کے مسترد کردیئے جانے کے نتیجہ میں جامعہ کا مالی بحران اور بھی شدت اختیار کرنے لگا۔ نظام حیدرآباد اس درس گاہ کو ماہانہ ایکہزار روپے کی گرانٹ دیا کرتے تھے۔ لیکن جب نظام حیدرآباد کی حکومت کے ارباب مجاز کو پتہ چلا کہ جامعہ ملیہ کے اسٹاف کے بعض ارکان نے تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا ہے تو یہ امداد مسدود کردی گئی حالانکہ نظام حیدرآباد کو مطلع کیا گیا کہ جن اساتذہ نے تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا وہ عملی سیاست میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اپنے استعفے پیش کرچکے تھے اور ان کا جامعہ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا لیکن یہ وضاحت بھی بے کار ثابت ہوئی

ان حالات کے باوجود ارباب جامعہ کے حوصلے پست نہیں ہوئے انہوں نے جامعہ کے موقف کو مضبوط و مستحکم بنانے کی مساعی جاری رکھی۔ ۱۷ مارچ ۱۹۲۷ء کو فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں جامعہ کا نیا دستور منظور کیا گیا اور یہ بھی طئے پایا کہ جامعہ کی رجسٹری کرائی جائے۔ فاؤنڈیشن کمیٹی کے اس اجلاس تک جامعہ کے کاروبار چلانے کی ذمہ داری فاؤنڈیشن کمیٹی، سنڈیکیٹ، اور اکیڈیمک کونسل پہ عائد ہوتی تھی لیکن اس اجلاس کے بعد اس ادارہ کے انتظامیہ کی حیثیت سے ایک ۳۰ رکنی مینجنگ کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کمیٹی کو جامعہ کے مالی اور اقتصادی امور کی یکسوئی کا مجاز بھی گردانا گیا۔ ڈاکٹر انصاری اس کمیٹی کے صدرنشین مقرر ہوئے اور ذاکر صاحب سکریٹری۔ مسٹر جمنالال بجاج کو اس کا خازن بنایا گیا۔ ارکان میں مسٹر جواہرلال نہرو، علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد۔ جناب عبدالمجید خواجہ مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مولوی عبدالحق، پروفیسر مجیب، جناب الطاف حسین اور چودہری خلیق الزماں شامل تھے۔

ذاکر صاحب خوب جانتے تھے کہ صرف کمیٹیوں کی تشکیل، اور قیام سے مسائل حل نہیں ہوتے اس کے لئے توجہ مسلسل اور عمل پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں اندازہ تھا کہ کوئی کمیٹی خواہ وہ کتنے ہی بڑے لوگوں پہ کیوں نہ مشتمل ہو جامعہ کو بچا نہیں سکتی انہوں نے "حرکت میں برکت" کا راستہ اپنایا۔ اور پھر ایک بار جامعہ کے سچے ہمدرد گاندھی جی

سے رجوع کیا۔ انھیں جامعہ کی زبوں حالی کی داستان سنائی اور اپنی جانب سے یہ تجویز پیش کی کہ جامعہ کے اساتذہ ہی سے یہ عہد لیا جانا چاہیئے کہ وہ بہر قیمت جامعہ کو باقی و برقرار رکھیں گے۔ ان کی یہ تجویز "انجمن تعلیم ملی" کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی گاندھی جی نے اس تجویز کو بیحد پسند کیا۔

مسٹر اے جی نورانی نے اپنی کتاب میں ذاکر صاحب نے اس دور میں ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی کے نام جو خطوط لکھے تھے، ان کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی ذاکر صاحب کا کس درجہ احترام کرتے تھے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جامعہ کا موقف کس درجہ خراب ہوگیا تھا۔ پہلے خط میں جو ڈاکٹر انصاری کا موصومہ ہے گاندھی جی لکھتے ہیں:

> "میں نے ذاکر صاحب سے جامعہ کی صورت حال پر تفصیلی بات چیت کی ہے اور اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ فی جامعہ کی صورت حال بیحد نازک اور تشویشناک ہے اس ادارہ پر قرض کا بار بڑھتا ہی جارہا ہے اور جامعہ ملیہ فنڈ کے نام سے عطیوں کی شکل میں جو رقم حاصل کی گئی ہے استعمال نہیں کیا جاسکتی جبتک کہ "ٹرسٹ ڈیڈ" کی رجسٹری نہ ہوجائے کیونکہ فنڈ کے قیام کے دستاویز میں انیصال رقم کے لئے یہ شرط رکھی گئی ہے جامعہ کا جو دستور مرتب کیا گیا ہے وہ میرے اور جمنا لال جی دونوں ہی کیلئے ناقابل قبول ہے۔ یہ دستور اُن باتوں کے بھی منافی ہے جو آپ کی موجودگی میں، اور آپ کے مشورہ ہی سے طے پائی تھیں۔ ان حالات میں کیا کیا جاسکتا ہے؟ میرے خیال میں نئی کمیٹی کو اپنے تمام اختیارات پروفیسروں کے سپرد کردینا چاہیئے جنہوں نے زندگی بھر جامعہ کی

خدمت گذاری کا عہد کیا ہے یا پھر کمیٹی کو سر گرم عمل ہونا پڑیگا اور اسے جامعہ کی مالی ضروریات کی تکمیل کی کامل ذمہ داری قبول کرنی ہو گی لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کمیٹی ایسی کوئی ذمہ داری کی تکمیل کے موقف میں نہیں ہے۔ اگر وہ خود کام نہ کرے اور اپنے اختیارات کو پروفیسروں کے سپرد کرنے میں اسے تامل ہو تو جامعہ بتدریج دم توڑ دے گی اور یہ بہت بڑا المیہ ہو گا۔ اگر جامعہ کی موت طبعی اور ناگزیر ہو تو اس کا رنج نہ ہو گا۔ لیکن غیر طبعی موت کا حزنیہ تو بہر حال ناقابل برداشت ہو گا۔ اجمل جامعہ فنڈ کے لئے اب تک جو عطیئے وصول کئے گئے ہیں ان کا کیا ہو گا؟ ہم چار عطیہ وصول کرنے والوں کے لئے متفقہ طور پر قابل قبول ٹرسٹ ڈیڈ تیار نہ کیا جائے تو رقم کی اجرائی کی واحد صورت یہ رہ جاتی ہے کہ دستور شائع کرا دیا جائے، اور عطیہ دہندگان سے پوچھا جائے کہ کیا اس نئے دستور کے تحت بھی وہ جامعہ پر اپنے عطیوں کے خرچ کئے جانے کو پسند کریں گے۔ اگر ہمیں حکیم صاحب سے محبت تھی اور اگر ہمیں جامعہ عزیز ہے تو مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے کسی کو بھی مذکورہ بالا تجویز پسند نہ آئے گی

"نوٹ:۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے اس خط میں مدت کا تعین نہیں کیا ہے

اور یہ درست بھی ہے۔ کیونکہ اس معاملہ میں مدت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حالات کے تحت آپ کسی نتیجہ پر پہونچنے میں تاخیر روا نہ رکھیں گے۔ تاکہ یا تو اعزاز واکرام کے ساتھ جامعہ کی تجہیز و تکفین عمل میں لائی جائے یا پھر جامعہ قدرے اطمینان سے اپنا کام جاری رکھ سکے۔"

ڈاکٹر انصاری کے موسومہ ۶ ر جولائی ۱۹۲۸ء کے اس مکتوب کے علاوہ مسٹر نورانی نے ۱۸ ر جولائی ۱۹۲۸ء کو مولانا شوکت علی کے نام تحریر کردہ گاندھی جی کے جس خط کا حوالہ دیا ہے اس کا متن یہ ہے۔

"میرے عزیز بھائی! مجھے ابھی ابھی آپ کا گرامی نامہ وصول ہوا۔ اپنی بہن کی وفات کا آپ نے جو سچا خاکہ پیش کیا ہے وہ آپ کے دکھ کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے۔ بلا شبہ ایک ایسی شخصیت کی جدائی جو بہن ہی نہیں بلکہ ایک مخلص دوست بھی تھی، آپ پر شاق گذری ہوگی۔ لیکن مجھے آپ کے عزم و حوصلہ کا اندازہ ہے اس لئے یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ خدا آپ کو اس صدمۂ جانکاہ کے برداشت کرنے کی طاقت عطا کرے۔ انگریز عہدہ داروں کی مذمت میں میں آپ کے ساتھ ہوں۔ لیکن میری خواہش یہ ہے کہ آپ اس بیرحم نواب کے لئے بھی اپنے دل میں نفرت و انتقام کو جگہ پانے کا موقع نہ دیں جس نے آپ کی بہن کی موت کے موقع پر شقاوت قلبی سے کام کیا۔ مجھے یقین ہے کہ ہائیکورٹ میں

زیر دوران مقدمہ کا فیصلہ آپ کے حق میں ہوگا
جامعہ کے بارے میں آپ کی رائے کی قدر کرتا
ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر ذاکر حسین
کو کامل اختیار نہ دیں تو جامعہ دم توڑ دیگی۔ سارا
اقتدار و اختیار کمیٹی کو دینے کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم
ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو فاقہ کشی میں
مبتلا کر دینا چاہتے ہیں اس کے بجائے اگر جامعہ پر
کنٹرول کے لئے ایک چھوٹی سی کمیٹی تشکیل دی جائے
ایک ایسی کمیٹی جس کا اجلاس ذاکر صاحب کسی وقت
بھی طلب کر سکیں تو مشکلات پر قابو پانے کی کوئی
صورت نکل سکتی ہے اس سے ہٹ کر جامعہ کے
موجودہ دستور میں تبدیلی بھی ناگزیر ہو چلی ہے
آپ ان تجاویز کو قبول کریں یا پھر اپنی طرف سے
کوئی نئی تجویز پیش کریں۔ اجمل فنڈ جو تھوڑی
سی رقم پر مشتمل ہے جامعہ کے کام آسکتا ہے اور
اس سے دستبردار ہو جانا دانشمندی کی دلیل نہیں
ڈاکٹر انصاری اس مسئلہ پر غور و خوص کے لئے سابرمتی
آرہے ہیں تو میں اور ذاکر صاحب اس مسئلہ
پر غور کریں گے۔ میں آپ کو سابرمتی آنے کی
زحمت اس لئے دینا نہیں چاہتا کہ آپ نے
جامعہ کے تعلق سے اپنی رائے ظاہر کر دی ہے
اور میرا خیال ہے کہ میں بھی آپ کو اپنا فیصلہ بدلنے

پر مجبور نہ کر سکونگا۔ میں جانتا ہوں کہ دہلی میں آپ
جو کچھ کریں گے وہ آپ کے فیصلے اور رائے کے
مطابق ہوگا۔ موتی لال جی کے بارے میں آپ
کا تاثر تکلیف دہ ثابت ہوا۔ میں اس تعلق سے
کسی نتیجہ پر پہونچنے کے موقف میں نہیں ہوں۔
لیکن میرا خیال ہے کہ موتی لال نہرو ذہنی تحفظ کے
ساتھ اظہار رائے کرنے کے مطلق عادی نہیں
ہیں کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اس سلسلہ میں کچھ کروں
اگر آپ مجھ سے کسی اقدام کے خواہشمند ہیں تو
بلا تامل مجھے مطلع کیجئے۔"

ذاکر صاحب نے عجلت، اور روا روی سے کام نہیں لیا تھا انہوں نے کافی سوچ بچار کے بعد گاندھی جی کو اپنی تجاویز سے واقف کرایا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حکیم اجمل خاں فنڈ کے لئے عطیوں کی اپیلیں کچھ زیادہ موثر ثابت نہیں ہو رہی ہیں جب کہ جامعہ کو فی الفور ۵۵ ہزار روپے درکار تھے۔ ذاکر صاحب نے ۲۹ر جولائی ۱۹۲۸ء کو ایک مکتوب کے ذریعہ امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری کو جامعہ کے مالی اور اقتصادی موقف سے واقف کرایا۔ انھوں نے صاف الفاظ میں لکھا کہ اب ٹرسٹیز کے لئے دو ہی راستے رہ گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے کو عطیوں کی وصولی کے لئے وقف کردیں یا پھر جامعہ کے نظم ونسق کو چلانے کی ذمہ داریوں سے بالکلیہ دستبردار ہو جانے کا اعلان کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس امر کی بھی وضاحت کی کہ دوسری صورت میں ان کا اخلاقی فریضہ ہوگا کہ وہ ان لوگوں کو جامعہ کی خدمت کا موقع دیں جو اس ادارہ کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں ذاکر صاحب نے بتایا کہ اسٹاف کے متعدد ارکان اپنے آپ کو جامعہ کی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہیں، وہ اس سلسلہ میں بڑی سے بڑی قربانیاں دینے پر آمادہ ہیں۔ زبانی

ہمدردی کی بجائے جامعہ کی عملی ہمدردی کا جذبہ رکھنے والے ان خدمت گذاروں کو اتنی مہلت تو دی جانی چاہیے کہ وہ اپنی سعی و کوشش سے اس کے حالات کو بہتر بنائیں۔

ڈاکٹر انصاری نے ذاکر صاحب کا یہ مکتوب اپنے نوٹ کے ساتھ ٹرسٹیز کو روانہ کر دیا۔ انھوں نے لکھا کہ جامعہ کے قرض کی ادائی کے لیے ۵۵ ہزار روپے جمع کرنا ممکن نہیں۔ نہ ہی جامعہ کے مزید اخراجات کی کفالت ٹرسٹیز کے بس میں ہے ان حالات کے تحت بہتر تو یہ ہے کہ وہ جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری سے دستبردار ہو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا کہ اس قسم کا اعلان ناخوشگوار فضا ضرور پیدا کریگا لیکن دیانتداری کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کی اجرائی میں تاخیر اور ٹال مٹول سے کام نہ لیا جائے کیونکہ جتنی دیر ہوگی حالات اتنے ہی بدتر ہوتے جائیں گے۔ انھوں نے ٹرسٹیز کو یہ بھی یقین دلایا کہ ان کا اعلان دستبرداری جامعہ کو ایک نئی زندگی عطا کرنے کا سبب بن سکتا ہے جب کہ ٹرسٹیز کی حیثیت سے ان کی برقراری جامعہ کے لئے موت کا سامان ثابت ہو رہی ہے انہوں نے ٹرسٹیز کو بتلایا کہ وہ اس معاملہ میں ذاکر صاحب سے بات چیت بھی کر چکے ہیں اور ذاکر صاحب نے جامعہ کی بقاء اور برقراری کے لئے جو منصوبہ تیار کیا ہے وہ اس سے کافی متاثر بھی ہیں۔

ذاکر صاحب نے اپنے منصوبہ میں انجمن تعلیم ملی کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ انجمن خود ان پر اور ان کے رفقائے کار پر مشتمل ہونی چاہیے وہ اور ان کے رفقائے کار اس نئے ادارہ کے ذریعہ جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری قبول کرنا چاہتے تھے ذاکر صاحب اور ان کے رفقائے کار نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ جامعہ کی خدمت گذاری کا اتنا ہی معاوضہ لیں گے جس سے ان کی بنیادی احتیاجات کی تکمیل ہو سکے تاکہ اس طرح جو بھی بچت ہو اس سے جامعہ کا قرض ادا کیا جا سکے۔ ڈاکٹر انصاری کو ذاکر صاحب پر پورا اعتماد تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنے عہد کی تکمیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے انہوں نے اپنے مذکورہ دونوں خطوط کی نقلیں تمام سیاسی قائدین کو روانہ کیں۔ جامعہ کے

اسی ہیجانی دور میں ذاکر صاحب نے اپنے اُن دوستوں کو بھی جو چھٹی پر تھے ایک مشترکہ خط لکھا تھا۔ آداب نہ سلام ۔ خیریت طلبی نہ رسمی القاب ! چند مختصر سے جملے!! یہی کہ جامعہ مقروض ہے ، اس کے وسائل محدود ہیں ۔ اور اب تو اس کے بند ہو جانے کا اندیشہ بھی پیدا ہو گیا ہے ۔ کیا آپ اس مرحلہ پر جامعہ کے کچھ کام آسکتے ہیں ۔ اس خط کا مقصد یہ تھا کہ یہ سب لوگ فوراً جامعہ واپس ہو کر رجوع بکار ہو جائیں ۔ ذاکر صاحب اور ڈاکٹر انصاری کو اپنے تحریر کردہ خطوط کے جواب مل گئے ۔ قائدین کے کم و بیش سبھی جوابی خطوط مایوس کن تھے ۔ ان میں لکھا گیا تھا کہ "جامعہ کو باقی و برقرار رکھنا مشکل ہے اس معاملہ میں کچھ نہیں کیا جا سکتا ۔ بہتر تو یہی ہے کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے ۔" جامعہ کے کارکنوں اور چھٹی منانے والے اساتذہ نے اس کے بالکل برعکس جواب دیا "ہم بہرحال جامعہ کو بند نہ ہونے دیں گے ہمیں اندازہ ہے کہ اس سلسلہ میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی ۔ لیکن ہم ہنسی خوشی ہر مصیبت کو برداشت کر لیں گے ۔

اس حال و ماحول میں انجمن تعلیم ملّی کی بنیاد رکھی گئی ۔ اور تاسیس انجمن کے موقع پر اس کے تمام ارکان نے عہد کیا کہ وہ کم از کم ۲۰ برس تک موجودہ مشاہروں پر ہی کام کرتے رہیں گے اور کسی صورت میں بھی ۱۵۰ روپے سے زائد تنخواہ نہ لیں گے ۔ جامعہ کے کارکنوں ، اور اساتذہ کے ایثار کا یہ عالم تھا کہ کسی نے بھی ۱۵۰ روپے ماہوار کا مطالبہ نہ کیا ۔ سبھوں کی تنخواہیں اس سے کم تھیں ۔ عہد نامہ پر ذاکر صاحب نے سب سے پہلے ۔ پھر مجیب صاحب نے ، اور ان دونوں کے بعد دس اساتذہ نے اپنے دستخط ثبت کیے ، انہیں جامعہ کے مینجنگ بورڈ کی رکنیت دی گئی ۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے عہد نامے پر دستخط تو ثبت نہیں کیے لیکن مقررہ شرائط پر ایک عرصہ دراز تک کام کرتے رہے ، اور اس طرح انجمن تعلیم ملّی جامعہ کو سیاسی قائدین کے اثر و نفوذ ، اور ان کے تسلط سے نجات دلانے کا سبب بنی اس دوران جامعہ کے ٹرسٹیز کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا ، اور اس میں انھوں نے اپنے تمام اختیارات انجمن تعلیم ملی کو

منتقل کر دیئے۔ انجمن نے وقت ضائع کئے بغیر جامعہ کو راست اپنی نگرانی میں لے لیا اور سیس فقرہ پر مشتمل ایک دستور منظور و نافذ کیا جس میں جامعہ کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وہ عوام اور بالخصوص مسلمانوں کو تعلیم کی سہولتیں بہم پہونچائے گی اور ملک کے آزاد ہونے تک حکومت سے کوئی مدد لیگی اور نہ ہی اس کے لئے کوئی کوشش کرے گی دستور میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ مذہب و فرقہ کی اساس پر جامعہ کوئی فرق و امتیاز روا نہ رکھیگی۔ انجمن تعلیم ملی کے ارکان دو قسم کے تھے۔ جو لوگوں نے ۲۰ برس انجمن کی خدمت گذاری کا وعدہ کیا تھا اور یہ شرط قبول کر لی تھی کہ اس اثنا میں انھیں کسی بھی مرحلہ پر ۱۵۰ روپے ماہانہ سے زائد معاوضہ نہ ملے گا انھیں تاحیات رکنیت دی گئی باقی ارکان عمومی نوعیت کی رکنیت کے حامل قرار دیئے گئے۔ ڈاکٹر انصاری کا انجمن تعلیم ملی کے صدر کی حیثیت سے، اور ذاکر صاحب کا اس کے سکریٹری کی حیثیت سے انتخاب عمل میں آیا۔ شری جمنالال بجاج خازن بنے گئے۔ پروفیسر مجیب، مولانا اسلم، خواجہ عبدالحئی، اور شفیق الرحمن قدوائی مینجنگ کمیٹی کے ارکان منتخب ہوئے۔

انجمن تعلیم ملی کے قیام کے بعد جامعہ کا جو سالانہ جلسہ منایا گیا اس میں کئی سرکردہ شخصیتیں شریک تھیں۔ اینی بسینٹ، موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، مولانا ابوالکلام آزاد، مدن موہن مالویہ، مولانا محمد علی، سرنواس آینگار، سینیہ مورتی اینی سی کیلکر اور آصف علی، معزز مہمانوں میں شامل تھے۔ اس موقع پر مدن موہن مالویہ نے قومی پرچم لہرانے کی رسم انجام دی۔ یہ جلسہ ایسے مرحلہ پر منعقد ہوا تھا جب کہ جامعہ شدید مالی بحران سے دوچار تھی ذاکر صاحب نے اس تاریخی اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے ان دنوں کی یاد دلائی جب کہ جامعہ کے عطیہ دہندگان کی فہرست میں اپنا نام دیکھ کر لوگ خوش ہوا کرتے تھے اور ایسے ایک اعزاز تصور کرتے تھے ذاکر صاحب نے کہا لیکن اب دن بدل گئے ہیں اور جامعہ کی امداد کے لئے حکیم اجمل خاں صاحب کی جاری کردہ اپیلیں بھی بے اثر ثابت ہوئی ہیں لیکن ہمدردانِ جامعہ کی اس بے حسی

کے باوجود جامعہ باقی ہے اور باقی رہے گی۔ انجمن تعلیم ملّی نے اسے بہر قیمت برقرار رکھنے کا عہد کرلیا ہے۔ کچھ دنوں بعد جامعہ کے بہی خواہوں نے "ہمدردانِ جامعہ" کے نام سے ایک اور ادارہ کے قیام کا اعلان کیا۔ اس نئے ادارہ کے قیام کی اپیل کا مسودہ بھی ذاکر صاحب ہی نے تیار کیا تھا جسے شفیق الرحمٰن قدوائی نے جاری کیا اور وہی اس نئے ادارہ کی روح رواں بن گئے۔ اس اپیل میں ہمدردانِ جامعہ سے کہا گیا تھا کہ وہ جتنی بھی امداد ان سے ممکن ہے ہر ماہ پابندی کے ساتھ جامعہ کو دیا کریں اور اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ جامعہ صرف ان ہی عطیوں پر چل سکتی ہے یہ نیا ادارہ بیحد کارآمد ثابت ہوا۔ دوسری طرف جامعہ کے قدیم طلبا نے نئے طلبا کو جامعہ میں شریک کرنے کی مہم بڑے پیمانے پر شروع کی اور اس مہم میں جناب معین الدین حارث، اور جناب قدوائی نے بڑی دلچسپی لی۔ یہ دونوں ذاکر صاحب کے عزیز ترین شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان ساری باتوں سے ہٹ کر جامعہ کا معیارِ تعلیم اس کے لیئے سب سے بڑا سہارا اور اثاثہ ثابت ہوا۔ اس ادارہ نے تعلیم کے معاملہ میں نئے اور کامیاب تجربات کیے۔ جامعہ ملیہ ہی وہ ادارہ ہے جس نے ابتدائی تعلیم میں پراجکٹ میتھڈ" کو رواج دیا۔ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب عبدالغفار مدھولی کو خصوصی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے موگہ بھیجا گیا۔ جہاں ایک امریکن ماہر تعلیم ریورنڈ ہارپر، پراجکٹ میتھڈ کا تجربہ کررہے تھے۔ واپسی پر مدھولی صاحب نے جامعہ ملیہ کے پرائمری اسکول میں یہی طریقہ تعلیم رائج کیا۔

ایک دن مس گرڈا فلپس بورن مدارس میں پہنچیں۔ وہ جامعہ کی خدمت کے ارادہ سے آئی تھیں۔ چند ہی دنوں میں وہ جامعہ کے طلبا اور اساتذہ میں بیحد مقبول ہوگئیں۔ اور آپا جان کے محبت بھرے لقب سے پکارے جانے لگیں۔ اس خاتون نے اپنے آپ کو پوری طرح جامعہ کے رنگ میں رنگ لیا۔ جامعہ میں بھی ان کے نام ان یہودی پناہ گزین بچوں کے خطوط ملا کرتے تھے جن کی انھوں نے برلن میں خدمت کی تھی

مس فلپس بورن کا سارا وقت جامعہ کی خدمت گذاری میں صرف ہو جاتا۔ "آپا جان" معاوضہ اور حق خدمت کے طور پر صرف ۷۵ روپے ماہانہ لیا کرتی تھیں۔ لیکن فرصت کے لمحات اور چھٹیوں میں دوسری جگہ کام کر کے کافی کما لیتیں اور یہ ساری کمائی جامعہ کے طلباء کے کام آتی۔ جامعہ نگر میں اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو مس فلپس بورن اس کی تیمارداری میں مصروف نظر آتیں۔ اس کے لئے میوہ لایا جا رہا ہے دوائیں منگوائی جا رہی ہیں اور ان ساری چیزوں کے دام آپا جان ادا کر رہی ہیں۔ ایک لڑکے پر ٹائیفائیڈ کا حملہ ہوا۔ توقع کے مطابق آپا جان بے چین ہو گئیں اور اسے اپنے ساتھ گھر لے آئیں۔ اس لڑکے کی تیمارداری سے آپا جان کو فرصت نہ ملی۔ آپا جان کے تعلق سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی سلمیٰ صدیقی جو ایک صاحب طرز ادیبہ ہیں اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں۔

> اکثر دہلی سے سعیدہ (ذاکر صاحب کی بڑی صاحبزادی) کے کسی دوسرے کام سے آپا جان مس فلپس بورن بھی علی گڈھ آئی تھیں۔ بچپن کی یادوں میں ان نیک دل خاتون کا چہرہ بھی اکثر یاد آتا ہے وہ ایک جرمن خاتون تھیں اور ذاکر صاحب نے ان کو بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت پر مامور کیا تھا۔ وہ خاتون اپنے کام میں اس قدر دلچسپی لیتی تھیں کہ جامعہ کے بچوں کے علاوہ بھی جہاں کہیں ان کو بچے نظر آتے وہ فوراً ان ہی کی دیکھ بھال میں لگ جاتی تھیں۔"

جامعہ ——— اب ایک نئے موڑ پر پہونچ رہی تھی۔ اور صاحبانِ فکر و نظر محسوس کرنے لگے تھے کہ یہ درس گاہ ایک منفرد اور بے مثال ادارہ کی شکل اختیار

کرنے لگی ہے۔ جن لوگوں کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ جامعہ باقی اور برقرار رہے گی وہ اب اس کے تابناک اور درخشاں مستقبل کی پیش گوئی کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی، اور بیگم محمد علی کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا، اور اسے مخاطب کرتے ہوئے ایک مقرر نے کہا کہ جامعہ کے ارباب مجاز کو واضح اور صاف الفاظ میں اس ادارہ کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرنی چاہیئے۔ ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں اس مقرر کے مطالبہ کی تکمیل کر دی، انہوں نے کہا

"جامعہ کے نصب العین سے واقفیت کے لئے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اس ادارہ نے ایک ایسے دور میں جنم لیا ہے جب کہ اسلام اور مسلمان دونوں ہی آزمائش میں مبتلا تھے۔ اور ہندستان کے دو بڑے مذاہب ہندو مت، اور اسلام کے ماننے والوں نے بدیسی غلامی سے نجات پانے کے مشترکہ مقصد کے تحت جدو جہد کا آغاز کیا تھا۔ جامعہ اسلام اور قومیت، کے خوشگوار امتزاج کی نمائندگی کرتی ہے وہ اسلامی تہذیب کی بقا اور ترقی کے لئے کوشاں رہے گی۔ اور دوسری طرف مشترکہ قومیت کے نظریہ کی آبیاری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گی اپنی لیاقت اور استطاعت کے مطابق وہ ملک کی تحریک آزادی میں حصہ لیگی یہی نہیں وہ مقاصد جن کے تحت اس ادارہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور جس کی تکمیل کے لئے وہ سرگرم عمل رہے گی۔"

ذاکر صاحب نے جامعہ کے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے قومی تحریک سے اس ادارہ کے ربط وتعلق پر بھی روشنی ڈالی۔ اور خود اپنے سیاسی انداز فکر کے تعلق سے کسی کو کسی قسم کے شک وشبہ میں مبتلا نہ رکھا۔ اس اثنا میں گاندھی جی نے ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو تاریخی ڈنڈی مارچ کا آغاز کیا اور اس تحریک نے جامعہ نگر میں جوش وخروش کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ جناب عبد الغفار مدھولی نے اس دور میں جامعہ کے لیل ونہار کا نقشہ بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں جب بھی ملک میں سیاسی اہمیت کا حامل کوئی واقعہ ہوتا تو جامعہ میں اس پر غور وخوض کے لئے جلسے منعقد ہوتے طلبا کو اس کے محرکات ومضرات سے واقف کرلیا جاتا۔ ایسے کسی بھی جلسہ میں ہر شخص کو اظہار خیال کی پوری آزادی حاصل ہوتی طلباء پہلے تقاریر کرتے۔ اس کے بعد اساتذہ کی باری آتی۔ آخر میں شیخ الجامعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ ڈنڈی مارچ کے آغاز پر منعقدہ ایسے ہی ایک جلسہ میں ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندستان کی ہر سیاسی تحریک بڑے شہروں تک محدود رہا کرتی تھی۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے پہلی مرتبہ ایک ایسی تحریک شروع کی جس کی صدائے بازگشت، گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں سنائی دینے لگی جس میں ہندستان کے عوام کی اکثریت آباد ہے۔ لیکن ان دنوں پنجاب میں انگریز حکمرانوں کے ظلم کے خلاف غم وغصہ کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی اور دوسری طرف خلافت تحریک بھی اپنا رنگ جما چکی تھی۔ اس لئے گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکا تھا، اور نتیجتاً یہ تحریک ناکام بھی رہی اس ناکامی نے برسوں تک مایوسی کی فضاء بنائے رکھی۔ اس دوران سب سے بڑی غلطی بھی سرزد ہوئی اور وہ یہ تھی کہ ملک کے لئے ایک نیا دستور ترتیب دینے کی کوشش کی گئی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ لارڈ برکن ہیڈ نے طنزاً کہا تھا کہ ہم کسی معقول دستور پر متفق الرائے نہیں ہوسکتے۔ اسی طنز کے رد وبدل کے طور پر نہرو رپورٹ

دستور کا ایک نیا مسودہ پیش کیا گیا۔ اور توقع کے مطابق اس مسودہ نے بڑی ناخوشگوار فضا پیدا کر دی۔ آزادی کے حصول سے پہلے دستور کی ترتیب و تیاری کی کوئی بھی کوشش بارآور ثابت نہیں ہو سکتی۔ گذشت آنچہ گذشت! کم از کم دس سال بعد پھر ایک بار ڈنڈی مارچ کی صورت میں آزادی کی جدوجہد کا آغاز ہو رہا ہے"

نہرو رپورٹ پر ذاکر صاحب کی یہ تنقید بجد جراءت مندانہ تھی۔ اس رپورٹ کا نزاعی حصہ وہی تھا، جو ملک کے اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ سے متعلق تھا۔ تمام حلقوں میں یہ بات موضوع بحث بنی ہوئی تھی کہ نہرو رپورٹ میں اقلیتوں کے لیے جن حقوق و مفادات کا تعین کیا گیا ہے وہ کافی ہیں کہ نہیں۔ لیکن ذاکر صاحب نے اس پر نئے انداز اور ایک نئے نقطہ نظر سے تنقید کی۔ انہوں نے جو باتیں کہی تھیں وہ تو بالکل انقلابی نوعیت کی تھیں۔ بہت کم لوگوں کو شائد اس بات کا علم ہے کہ وہ ہر مسئلہ پر ایسے ہی نئے اور انقلابی انداز میں غور و خوض کے عادی تھے

ذاکر صاحب۔ ایک ادیب، مصنّف اور مقرر

ذاکر صاحب نے غالباً اسی زمانہ میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کیں، لیکن اپنی ادبی زندگی کا آغاز انہوں نے ایک نسوانی نام "رقیہ ریحانہ" سے کیا۔ اسی نام سے انہوں نے مشہور کہانی ابو کی بکری لکھی بظاہر یہ کہانی ایک خوبصورت بکری کے گرد گھومتی ہے جو المطورہ کے ابوخاں نے پال رکھی تھی۔ اور جو اسے بہت عزیز تھی۔ ابوخاں اس کے دانہ چارہ کا انتظام کرتا۔ اس کی پرورش و پرداخت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن جنگل میں آزادی سے گھومنے پھرنے کا مزہ ابوخاں کی نعمتوں میں کہاں وہ ایک دن ابوخاں کی آنکھ بچا کر جنگل کی طرف بھاگ نکلتی ہے لیکن جنگل کے مصائب کی تاب نہ لا کر ایک دن دم توڑ دیتی ہے۔ اس کہانی کے ذریعہ ذاکر صاحب نے دوسروں کی عطا کردہ جنت پر کس کر طنز کیا تھا۔ اور اپنے ننھے منے قارئین کے ذہن میں یہ بات

بٹھانا چاہتے تھے کہ بدیسی حکمرانوں کی جود و سخا پر تکیہ کرنا حریت پسندوں کا شیوہ نہیں قفس کی تیلیاں سونے ہی کی کیوں نہ ہوں، ان سے قفس کی نوعیت و ماہیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ برسوں بعد ۲۲ اپریل ۱۹۲۵ء کو ذاکر صاحب نے ہندستان ٹائمز کے نمائندہ خصوصی سے ایک انٹرویو میں "ابو کی بکری" کی شان نزول پر روشنی ڈالی انہوں نے بتایا کہ یہ کہانی ڈومینین اسٹیٹس (نوآبادیاتی درجہ) کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ ذاکر صاحب، جواہر لال نہرو، اور اپنے دور کے دیگر انقلابیوں کی طرح ڈومینین اسٹیٹس کو غلامی ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل تصور کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے الفاظ میں "ذاکر میاں نے بچوں کے لیے جو کتابیں لکھیں، یہ مکتبۂ جامعہ کی بہترین مطبوعات میں سے ہیں۔ کاغذ اور جلد کی عمدگی کے علاوہ ان میں مشہور آرٹسٹ گجرال کی بنائی ہوئی تصاویر بھی ہیں، اور خاص طور پر "ابو کی بکری" تو اپنے حسن معنوی، اور حسن صوری کے لحاظ سے ایسی کتاب ہے کہ اگر اسے یورپ میں بچوں کی کتابوں کی کسی نمائش میں رکھا جائے تو تعریف ہی ہوگی شرمندہ ہونے کی نوبت نہ آئے گی۔ ظاہری محاسن کے ساتھ ساتھ اس کی معنوی خوبیاں اس کی سلیس اور سادہ زبان، فطری طرز بیان جیسے کسی سے باتیں ہو رہی ہوں۔ یہ سب چیزیں بچوں کی تخلیقی، صلاحیتوں کو یقیناً جلا دے سکتی ہیں۔

ذاکر صاحب کا علمی ذوق بہت بلند معیار کا رہا۔ انتظامی مصروفیات کی بناء پر علمی کاموں کے لئے وہ زیادہ وقت نہ دے سکے لیکن ان حالات میں بھی انہوں نے اپنی جو تصانیف چھوڑی ہیں وہ ان کے معیارِ فکر و قلم کی ترجمانی کے لئے کافی ہیں ۱۹۳۲ء میں انہوں نے الہ آباد کی ہندستانی اکیڈمی کی دعوت پر "معاشیات، مقصد اور منہاج" کے موضوع پر تین مقالے پڑھے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں دہلی یونیورسٹی کی خواہش پر انھوں نے سرمایہ داری کے موضوع پر دس لکچر دیئے جنھیں پہلے دہلی یونیورسٹی نے شایع کیا تھا۔ اور اس کا دوسرا ایڈیشن ایشیا پبلشنگ ہاؤس علی گ

نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب نے جرمن ماہر معاشیات فریڈرک لسٹ کی کتاب "قومی معاشیات" کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب معاشیات کی کلاسکس میں شمار ہوتی ہے۔ احمد آباد کے "لاسکی انسٹی ٹیوٹ" کی درخواست پر انہوں نے "مملکت اور اخلاق" کے موضوع پر توسیعی لکچر دیئے تھے اور بتایا کہ کس طرح اخلاقی اصول مملکت کے لئے نصب العین کا کام دیتے ہیں ذاکر صاحب ایک تحریک کردار کے حامل فرد اور ایک سرکردہ ماہر تعلیم ہی نہیں، اردو کے چوٹی کے انشاء پرداز بھی تھے اظہار خیال کی اعلیٰ صلاحیت اور خلوص دونوں مل جائیں تو انشاء پردازی جنم لیتی ہے اور ذاکر صاحب کی تحریروں میں یہ دونوں چیزیں ملتی ہیں۔ ان کے طرز تحریر میں، جوش، ولولہ، تازگی اور بلا کی اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ علمی اور ادبی مضامین سے ہٹ کر ان کے تعلیمی خطبات اور تعلیمی امور پر ان کی رپورٹوں میں بھی وہ خشکی نظر نہیں آتی جو بالعموم ایسی "چیزوں" کا امتیازی نشان سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً ۱۴ اگسٹ ۱۹۳۵ء میں "کاشی ودیا پیتھ" کے جلسہ تقسیم اسناد کے خطبہ کا یہ حصہ پڑھئے اور ذاکر صاحب کے زبان وبیان کی داد دیجئے۔

"جس دیس میں تم یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بدنصیب
ملک ہے وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے
بے انصافیوں کا ملک ہے۔ بیرحمیوں کا ملک ہے
ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا
ملک ہے۔ بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک
ہے بھوک اور مصیبت کا ملک ہے۔ افلاس اور
ناداری کا ملک ہے غرض بڑا کمبخت ملک ہے
لیکن کیا کیجئے کہ اسی میں جینا، اور اسی میں مرنا ہے
اس لئے یہ ملک تمہاری ہمتوں کا امتحان،"

تمہاری قوتوں کے استعمال اور تمہاری محبت کی
آزمائش کی جگہ ہے ـــــ ''

اس قسم کے خطبات اور رپورٹیں، ذاکر صاحب جس انداز سے جن حالات میں لکھا کرتے تھے۔ ذرا جناب رشید احمد صدیقی کی زبان سے ان کی تفصیل بھی سن لیجئے۔

"بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ ذاکر صاحب نے علیگڈھ میں میرے ہی مکان کے ایک کمرہ میں بیٹھ کر شاید ایک ہفتہ کے اندر مرتب کر ڈالی کمرہ بھی ایسا جو بیک وقت سونے بیٹھنے کھانے پینے اور لکھنے پڑھنے کا کام دیتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی، اس سلسلہ میں کچھ دوست ملنے آ گئے تو ان سے خوش گپی ہونے لگی ۔ کتابوں رپورٹوں، فائیلوں وغیرہ کا انبار سا لگا ہے ۔ کاغذات پھیلے ہوئے ہیں ۔ کوئی خوانچہ والا پہونچ گیا تو جو کچھ اس کے پاس رہا اسی سے شغل شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آ گئے تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے شعر و شاعری کا شائق آ گیا تو شعر خوانی کی مجلس گرم ہو گئی ۔ کوئی اچھا طالب علم آ نکلا تو اس کے مضمون پر باتیں ہونے لگیں ــ اس تمام بحث و مباحثہ میں ذاکر صاحب اس خوبی سے حصہ لیتے جیسے تمام عمر اسی شغل میں بسر ہوئی ہے۔ ذرا مہلت ملی تو پھر رپورٹ کی ترتیب کا کام شروع ہو جاتا۔

ایک دن میں نے تنگ آکر کہا۔ مرشد یہ کہاں کا
کھڑاگ پھیلایا تمام دن خدائی خواروں اور حق بخشوائے لوگوں
کا مجمع رہتا ہے" فرمایا ! سب کچھ ٹھیک
ہو گیا ہے۔ آج اتفاق سے پنسل بنانے کیلئے کسی
کے پاس چاقو نہ ملا ورنہ بقیہ مراحل بھی طے ہو جاتے "

اس تمام کھڑاگ کے باوجود ذاکر صاحب نے مقررہ مدت میں رپورٹ کی ترتیب کا کام مکمل کرلیا۔ اور پھر رشید صاحب کے ساتھ ڈاکٹر اصغر کے ہاں چائے پینے چلے تو اس نیت سے کہ اگر ان کی بلی نے بچے نہ دیئے ہوں تو کم از کم کتیا ہی کا بچہ لے آئیں تاکہ سعید (ذاکر صاحب کی صاحبزادی) خوش ہو جائے۔ ذاکر صاحب ہی کے الفاظ میں "اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد کچھ نہ کچھ گھر لے جانا تو ضروری تھا" کیوں بیوی کہتی ہیں "اس اثنا میں کیا کھویا ــــ اور سعیدہ پوچھتی ہے کیا لائے"

بقول آل احمد سرور

" ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ایک مفکر کی تابانی فکر، ایک معلم کی شفقت و مرحمت، ایک عاشق کا سوز و گداز، ایک مدبر کا وزن و وقار، ایک صوفی کی درویشانہ شان، اور ایک مہاتما کی سی معصومیت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ علوم میں ان کی معلومات ہمہ گیر و ہمہ رنگ ہیں فلسفہ اقتصادیات، ادب، سائنس، تعلیم و تصوف مذہبیات، ہر موضوع پر ان کا مطالعہ گہرا، اور ان کا علم حاضر ہے۔ ان کے یہاں علم صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں، انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی خدمت

کا وسیلہ بھی ہے اگر وہ صرف مصنف ہوتے تو ان کا درجہ
بہت بڑا ہوتا۔ مگر ان کی سیمابی فطرت نے
کبھی تصنیف و تالیف کے گوشۂ عافیت پر
قناعت نہیں کی۔ انہوں نے اپنے آپ
کو کتابوں میں بھی بند نہیں کیا۔ مگر جب کبھی کچھ لکھا
تو اپنے خلوص، دلسوزی، اور سماجی شعور کی وجہ
سے الفاظ میں وہ چھپی ہوئی بجلیاں بھر دیں جن
کی وجہ سے ادب میں آب و تاب آتی ہے، اور
جن سے انسانوں کی زندگی بدلتی سنورتی اور نکھرتی ہے"

ذاکر صاحب کی پہلی قابل ذکر تصنیف افلاطون کی ریاست کا اردو ترجمہ ہے جس کے بارے میں مولانا اقبال احمد سہیل نے یہ رائے دی تھی کہ اگر افلاطون کو اردو آتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔ ان کی ایک اور قابل ذکر تصنیف جو خالصتاً معاشی مسائل سے تعلق رکھتی ہے، اپنے دلنشین اسلوب اور پیرایہ بیان کی بناء پر ادبی کتابوں میں بھی شمار کی جاسکتی ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ علمی مسائل پر ایک مخصوص پیرایہ ہی میں بحث کی جاسکتی ہے، ان کے لئے ذاکر صاحب کی تصنیف "معاشیات۔ مقصد اور منہاج" نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ وہ ایک معلم کی حیثیت سے محسوس کرتے تھے کہ استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا۔ محبت کا عنوان ہوتا ہے۔" یہی جملہ ان کی کتاب سے سرنکالکر کہتا ہے کہ "جب ساری دنیا مایوس ہوجاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینہ میں امید باقی رہتی ہے۔ ایک اس کی ماں۔ اور دوسرا اچھا استاد" ان کے اسی خلوص، علم، اعتماد اور عرفان نے الفاظ کو آتش نفسی کا گر سکھا دیا ہے عام زبان سادہ مگر جا بجا دلکش ترکیبیں مرصع فقرے دل میں اتر جاتے ہیں اور رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ جذبات کا طوفان موج زن ہے۔ مگر اظہار پر مکمل قابو خیالات کی بازی گری

نہیں علم کی نمائش نہیں تازہ افکار اس طرح چھلکتے ہیں جیسے مینا سے آتش سیال ابل جائے۔" اور پھر ایمان و ایقان یہ کہ "آدمی دوسرے آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے۔ اور چاہے روز فریب کھائے ۔ ہر روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے اور عقل مندوں و بیوقوفوں، دونوں کو کہ گمراہ ہوتے ہیں، معاف کرے۔"

عجب آزاد مرد تھا

ذاکر صاحب فطرتاً کٹرپن کے دشمن تھے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے انداز فکر پر کسی بندھے ٹکے مکتب خیال کی چھاپ نہیں لگائی جا سکتی ۔ جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے، خود جامعہ کے اندر ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں کے دو الگ الگ گروہ موجود تھے ۔ اور ان دونوں میں چشمک ہوا کرتی تھی ۔ لیکن ذاکر صاحب کی افتاد طبع نے، انھیں دونوں ہی گروہوں کی نظر میں ایک غیر جانبدار شخصیت بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اور انتظامی امور میں وہ جو مشورے بھی دیتے، انھیں، دونوں گروہ بڑی خوشی سے قبول کر لیتے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذاکر صاحب ہی کے وجود نے جامعہ کے داخلی اختلافات کو اس منزل پر پہونچنے نہ دیا کہ اس کا شیرازہ منتشر ہو جاتا رعب داب اور جبر سے کام لینا انھیں بالکل پسند نہ تھا وہ اپنے رفقائے کار سے صاف الفاظ میں کہتے کہ اگر وہ جامعہ سے وابستگی مناسب نہیں سمجھتے یا اس سے ان کے مستقبل کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے تو وہ بخوشی جامعہ سے علاحدگی اختیار کر لیں ۔ جرمنی سے واپسی کے بعد جامعہ کے حالات کو بہتر بنانے اور اسے ایک مثالی درسگاہ کی شکل دینے میں ذاکر صاحب کا بڑا دخل رہا ہے ۔ انتہائی ناموافق ماحول میں، ان کی کارکردگی نے بہت جلد انھیں سرکردہ ماہرین تعلیم کی صف میں شامل کر دیا ان کی بے لوث خدمات، قومی قائدین پر بھی اثر انداز ہونے لگیں ۔ جواہرلال نہرو، سی راجگوپال چاری اور ڈاکٹر سید محمد اقبال جیسی شخصیتوں کا بھی مرکز نظر بننے لگی اور انھوں نے

اس کا متعدد مرتبہ معائنہ بھی کیا۔ ہر ملاقات میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین انھیں اپنی سنجیدگی فکر سے متاثر کرتے حالانکہ یہ وہ دور تھا جب کہ جامعہ شیخ الجامعہ اور اس ادارہ سے وابستہ سبھی لوگ بے پناہ غربت کا شکار تھے۔ اساتذہ کو شاذونادر ہی وقت پر تنخواہ ملتی، لیکن کسی زبان پر حرف شکایت نہ آتا۔ سبھی جانتے تھے کہ انھیں بہت بڑا کام انجام دینا ہے، اور اس کے لئے مصیبتیں اٹھانا ضروری اور ناگزیر ہے۔ درخشاں اور تابناک مستقبل پر غیر متزلزل ایقان نے انھیں صبر آزما حال سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا تھا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ جامعہ کے اساتذہ نے ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا طئے یہ پایا کہ اس مذاکرہ میں اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ جامعہ نے کس حد تک اپنے مقاصد کی تکمیل کی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا مذاکرہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۳ء کو منعقد ہوا۔ اور ذاکر صاحب نے سب سے آخر میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ "میں جامعہ کو ایک ایسا اسلامی ادارہ سمجھتا ہوں جس کا مقصد ہندستانی مسلمانوں کو اسلامی عقائد اور ثقافت کی تعلیم دینا ہے" اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بتایا کہ، اسلام وحدانیت کی بنیاد پر قائم ہے، اور ساری دنیا کے انسانوں کے مابین محبت واخوت کے اٹوٹ رشتہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب وثقافت کے بارے میں ذاکر صاحب نے کہا کہ پیغمبر اسلام کا اسوۂ حسنہ، اور ان کے بتائے ہوئے نصب العین کی تکمیل کے لئے ہماری مساعی عبادت ہے اسلامی تہذیب وثقافت سے اسی نصب العین کے تحت ہم پر یہ لازم آتا ہے کہ ہم وطن سے محبت کریں، اور اردو کی بقا اور ترویج کیلئے سرگرم عمل رہیں، چونکہ وطن کی محبت اور اور اردو کی خدمت گذاری کے جذبہ ہی کے تحت جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا اس لئے ایسے اسلامی ادارہ کا نام زیبا جانا چاہیئے۔ اسی دور میں بین الاقوامی شہرت کی حامل ترکی کی ادیبہ خالدہ ادیب خانم بھی جامعہ کا معائنہ کر چکی تھیں۔ ڈاکٹر انصاری کی خواہش پر جو ان کے گھر سے دوست تھے انہوں نے جامعہ ملیہ میں کئی لکچر بھی دیئے۔ ۱۹۳۵ء کے یہ یادگار لکچر مکتبہ جامعہ ملیہ نے "ترکی میں مشرق ومغرب کے تصادم" کے زیر عنوان

کتابی شکل میں شائع کئے ہیں ۔ خالدہ ادیبہ خانم کی ۸ توسیعی تقاریر کی صدارت کرنے والوں میں ڈاکٹر انصاری کے علاوہ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر اقبال ، سروجنی نائیڈو بھگوان داس بھولا بھائی دیسائی ، اور مولانا سلیمان ندوی جیسی جلیل القدر شخصیات شامل تھیں۔

اس اثنا میں جامعہ کا مالی موقف قدرے بہتر ہو گیا اور جامعہ کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے دہلی کے مضافاتی علاقہ اوکھلا میں زمین خریدنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی۔ سنگ بنیاد رکھنے کی رسم جامعہ کے سب سے کم عمر طالب علم نے انجام دی ۔ اس تقریب میں خالدہ ادیبہ خانم بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئیں ۔ انہوں نے اپنی تقریر میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ

"مجھ سے ہر شخص یہی پوچھتا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے متعلق میری کیا رائے ہے ـــــ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو خود ان کے ہموطن بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکے ہیں ۔ میری حد تک میں بلاخوف تردید کہہ سکتی ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں ذاکر صاحب کی طرح سیدھا سادھا اور ایماندار آدمی نہیں دیکھا ۔ ان کو سمجھنے میں شاید اس لئے دشواری پیش آرہی ہے کہ انھوں نے اپنے آپ پر کسی سیاسی جماعت کا لیبل نہیں لگایا ہے ، اور ان کی سرگرمیوں کا جماعتی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے ، وہ اپنا سارا وقت تعلیمی مسائل کے لئے دیتے ہیں اور اس سلسلے میں نئے تجربات بھی کر رہے ہیں ۔ میں ان سے ہندستان

کے باہر، ان کے زمانۂ طالب علمی میں بھی مل چکی ہوں۔ اس وقت بھی وہ داڑھی رکھتے تھے اور آج بھی ان کے گول چہرہ پر داڑھی موجود ہے امتدادِ وقت نے نہ تو ان کے چہرہ مہرہ پر کوئی اثر ڈالا اور نہ ہی ان کی افتادِ طبع میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ان کی نگاہوں میں بلا کی کشش اور مقناطیسیت پائی جاتی ہے اور آنکھیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ انھیں بس ایک ہی لگن ہے میں نے انھیں بیحد غصہ میں بھی دیکھا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ میری موجودگی ہی میں جذبات سے مغلوب ہوکر رو پڑے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ انھوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ یہ بات بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں کہ مغربی ممالک میں اتنے دن رہنے اور مغربی علوم میں مہارت و کمال حاصل کرنے کے باوجود، ذاکر صاحب میں نہ تو احساسِ برتری پیدا ہوا اور نہ ہی ان کے لب و لہجہ میں کوئی فرق آیا۔"

ذاکر صاحب کی شہرت و مقبولیت کے اس دور میں انھیں جلسوں کو مخاطب کرنے کی دعوتیں دی جانے لگیں۔ بعض گوشوں سے خواہش کی گئی کہ وہ اپنے کسی پسندیدہ موضوع پر کتاب لکھیں ـــــ کاشی ودیا پیتھ سے انھیں دعوت نامہ وصول ہوا کہ وہ اس کے جلسۂ تقسیم اسناد کو مخاطب کریں۔ جو ۱۴/ اگسٹ ۱۹۲۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس امر کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ کاشی ودیا پیتھ کی ابتداء بھی جامعہ ملیہ کے انداز میں ہوئی۔

اور اس کا شمار بھی ہندستان کے ابتدائی قومی تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ اس جلسہ میں ذاکر صاحب نے جو خطبہ پڑھا وہ نہ صرف اردو ادب کا ایک شاہکار ہے بلکہ اس میں انہوں نے بعض اہم مسائل کا بڑی بیباکی اور جرأت سے تجزیہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے کہا "تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے۔ جو وہ اس لئے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے، اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی کر سکیں۔ قومی زندگی میں تعلیم اسی طرح گذرے ہوئے زمانہ سے موجودہ زمانہ کو ملاتی ہے۔ جیسے اکیلے آدمی کی زندگی میں اس کا حافظہ! جو سماج اپنی تعلیم کا انتظام درست نہیں رکھتی وہ اپنے وجود کو خطرہ میں ڈالتی ہے اور جس طرح حافظہ کے ختم ہو جانے سے اکیلی زندگی کا سلسلہ باقی نہیں رہتا اسی طرح قومی تعلیم نہ ہونے سے قومی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کی سماج میں ہندستانی سماج کو اپنی علٰحدہ حیثیت قائم رکھنی ہے اور دوسرے سماجوں کے مقابلے میں اس کے پاس کچھ ہے جو اسے دوسروں سے الگ کرتا ہے اور وہ اس قابل ہے کہ باقی رہے اور دنیا کی زندگی اس سے مالا مال ہو تو ہماری سماج کا فرض ہے کہ اپنی تعلیم میں ان خاص چیزوں کا خیال رکھے جنھیں وہ خاص اپنا سمجھتی ہے یا اپنے گذرے ہوئے زمانے کو اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام کرے اس لئے کہ صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے ہماری تاریخ زندہ نہیں رہ سکتی اس کی زندگی کی بس ایک صورت ہے کہ وہ سماج کے ہر فرد کے دل و دماغ کے ریشہ ریشہ میں زندہ ہو۔"

اس خطبہ میں ذاکر صاحب نے لکھا ہے کہ "بچہ جس سماج میں پیدا ہوتا ہے اس کے تمدن سے نسلی تعلق کی وجہ سے ہی اس کے ذہن میں کچھ مناسبتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس لئے خود اپنی سماج کے تمدن کی چیزوں سے اس کے ذہن کو بہتر تربیت ہو سکتی ہے۔ تربیت پا جانے اور ترقی کر چکنے کے بعد ذہن دوسری سماجوں کی چیزوں کو بھی اپنا سکتا اور اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ خود تعلیم کی ماہیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم

قومی تعلیم کا نظام قائم کریں ـــــ "

ذاکر صاحب نے ہندستان کے ہمہ رنگ سماج میں قومی تعلیم کے انتظام کی راہ میں حائل ہونے والی دشواریوں کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے ہمارے ملک کے مختلف تہذیبوں، مختلف عقائد کے ماننے والے لوگوں اور متضاد روایات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ بات سیاسی اور تعلیمی دونوں ہی نقاط نظر سے مناسب ہوگی کہ ہر تہذیبی گروپ کی انفرادیت کے احترام کے ساتھ ان کی اپنی زبانوں میں تعلیم دی جائے۔ ذاکر صاحب ہی کے الفاظ میں "ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں جن کی بولیاں الگ الگ ہیں۔ رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں۔ عادتیں، اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولہ میں ان تفریقوں کو پس پشت ڈال دیں یا ہر صوبہ اور ہر گروہ کو جس کا تمدنی اثاثہ اتنا ہے کہ وہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا اثاثہ بن سکے' اس بات کا موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے۔ اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے اگر آپ کے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا سیاسی دانشمندی کا تقاضہ ہی نہ سمجھا جائے بلکہ خود صحیح تعلیم کے لئے لازمی مانا جائیگا مثال کے طور پر آپ ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ کیا ہندستان کا قومی نظام تعلیم ان مسلمانوں کو اس بات کا موقع دیگا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو تعلیم کا ذریعہ بنائیں ممکن ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لئے مضر ہو مگر ہمارے ماہرین تعلیم نیک نیتی سے ہندستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول

کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضہ ہے آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے باربار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور اس کے مستقبل کا صحیح تصور قائم نہ کرسکنے کا دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے۔ اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا۔ سو ہوگا ہی ـــــ خود ہندستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا ـــــ۔

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما
گلستان میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندستانی، اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملّی وجود کو خود اپنے لئے ہی بے بہا نہیں سمجھتے، بلکہ ہندستانی قومیت کے لئے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے، یا کمزور کئے جانے کو اپنے ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی ـــــ اور نہ کوئی مسلمان انکے ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے ـــ ہندستان میں ان کا دین، ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری

ان پر ڈالے، ان کے لئے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مسلمان سیاست کے میدان میں دوسری تمام ہندی آبادی کے پہلو بہ پہلو ہونگے، جداگانہ اور مشترکہ انتخابات کے جھگڑے ٹنٹے بھی بھلائے جاچکے ہونگے اور غالباً ملازمتوں کے حصول میں بھی مسلمان ایک خوددار گروہ کی طرح بجائے تحفظ کے مقابلہ پر اصرار کرتے ہوں گے۔ اس وقت بھی وہ یہ ضرور چاہیں گے کہ ان کی تعلیم کے نظام میں ان کی تمدنی اقدروں کو پورا پورا دخل ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی دانشمند ہندستانی حکومت ان کے اس مطالبہ کو پورا کرکے مسلمانوں کی ترقی اور ان کی ترقی سے خود اپنی مضبوطی کا سامان کریگی۔"

قومی مسائل کا اس انداز میں تجزیہ دل گردہ کی بات تھی۔ ذاکر صاحب نے جہاں ہر تہذیبی گروہ کے ارتقاء کی ضرورت پر زور دیا، وہیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ قومی تعلیمی نظام ایسا ہونا چاہیئے کہ قوت سے محبت کا جذبہ پیدا ہو' اور اسے تقویت ملے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ باتیں انھوں نے آج سے ۳۵، ۴۰ سال پہلے کہی تھیں جب کہ ملک میں بیرونی سامراج کا تسلط تھا۔ ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بھی حالات سے مطمئن نہیں ہے۔ انھوں نے ودیا پیٹھ کے طلبا کے اجتماع میں اس صورت حال کا ذکر کیا اور کہا۔

"ممکن ہے کہ اپنے چاروں طرف، اتنی تباہی
اتنی مصیبت اتنا ظلم دیکھ کر تم بے صبری میں
یہ چاہو، جیسے بہت سے نوجوان چاہنے
لگتے ہیں کہ اس میں بسنے والی سماج ہی کو ختم کردو
اور برباد کر ڈالو۔ اس لئے کہ اس میں سدھار
کی کوئی صورت نہیں۔ تمہیں اختیار ہے مگر

اپنے ایک بھائی کی رائے سن لینے میں بھی کیا نقصان ہے۔ سو میرا خیال یہ ہے کہ تباہی سے ہمارا کام کچھ سہل نہ ہوگا تباہی تو پہلے ہی سے کافی موجود ہے۔ قومی زندگی کا کون شعبہ ہے جس میں پہلے سے کافی تباہی کا زور دورہ نہیں لیکن ہماری بے شمار بیماریوں، اور ان گنت مصیبتوں میں سے ایسی بہت کم ہیں کہ ہم یکایک گھبرا کر تھوڑی سی دیر میں انھیں ختم کر ڈالیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بگاڑنا اتنا نہیں ہے جتنا بنانا ہے ہمارے دیس کو ہمارے خون سے ابلتے دھارے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہمارے ماتھے کے پسینہ کا بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے۔ ضرورت ہے کام کی۔ خاموش اور سچے کام کی۔ ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی کاریگر کی دھوئیں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسہ کے پھوس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے سیاسی جھگڑوں کانفرنسوں، اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے حصوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ان میں صدیوں تک کیلئے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا اور ان جگہوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم ہوتی ہے جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ ہاں کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے۔"

اسی دور میں بنیادی تعلیم کی اسکیم منظر عام پر آئی، اور ذاکر صاحب نے اس کی عمل آوری کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس اسکیم کی کچھ لوگوں نے مخالفت کی اور ذاکر صاحب کو جو اس معاملہ میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے ان کرم فرماؤں کا ہدف تنقید بننا پڑا لیکن جن صائب الرائے افراد نے اس اسکیم کو پسند کیا وہ ذاکر صاحب کے خلوص اور تعلیمی امور و معاملات میں ان کی مہارت کے اعتراف پر مجبور ہو گئے۔ گاندھی جی بہت عرصہ سے ہندستان میں مروجہ تعلیمی نظام سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے لگے تھے۔ اس خصوص میں انہوں نے اپنے رسالہ "ھریجن" میں مضامین کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان مضامین کی تائید و مخالفت بھی ہونے لگی اسی حال و ماحول میں ۲۲ اور ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو گاندھی جی کی زیر صدارت کل ہند قومی تعلیمی کانفرنس کا دو روزہ اجلاس، وار دھا میں منعقد ہوا۔ اپنے صدارتی خطبہ میں گاندھی جی نے توقع کے مطابق بنیادی تعلیم کا خاکہ پیش کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ کام کے ذریعہ تعلیم کے طریقہ کو سائنٹیفک ڈھنگ سے رائج کیا جائے۔ گاندھی جی نے اس امر کی وضاحت کی کہ ان کا مقصد صرف یہ نہیں کہ نام نہاد مروجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کو دستکاری کی تربیت دی جائے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ پورا تعلیمی ڈھانچہ کچھ اس طرح بدلا جائے کہ تعلیم کو کسی دستکاری یا صنعت کی تربیت کا ایک جزو بنا دیا جائے۔ گاندھی جی کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے کانفرنس کو مخاطب کیا۔ انہوں نے کہا کہ گاندھی جی کی اسکیم ندرت خیال کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ صرف اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے تحت، تعلیم کسی بھی پیشہ یا حرفت کا ایک جزو لازم بن جائے گی۔ ذاکر صاحب کے اس ریمارک نے گاندھی جی کے بعض پرستاروں کو ناراض کر دیا لیکن ان کا خیال کئے بغیر ذاکر صاحب نے کہا غالباً گاندھی جی یہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے ایک بالکل ہی نئی اسکیم پیش کی ہے، اور اسے صرف ایسے ہی لوگ قبول کر سکتے ہیں جو عدم تشدد اور دیہی تہذیب کی اہمیت پر ایقان رکھتے ہیں لیکن ماہرین تعلیم گاندھی جی کے اس ادعا کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ وہ شروع ہی سے اس نظریہ کو مانتے ہیں کام کے ایک جزو کی حیثیت سے جو تعلیم دی جاتی ہے

صحیح معنوں میں وہی تعلیم ہوتی ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ بچوں کو مینول ورک کے ذریعہ بہت سی نئی باتیں سکھائی اور نئے مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں۔ اس نظریہ کے ماننے والوں میں دیہی تہذیب کی اہمیت کو تسلیم کرنے والے بھی ہیں۔ اور ایسے لوگ بھی جو شہروں کی تہذیب ہی کو ثقافت کی جڑ اور روح قرار دیتے ہیں، عدم تشدد پر ایقان رکھنے والے بھی ہیں، اور اس کے مخالفین بھی۔ اساتذہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تیرہ سال کی عمر تک بچوں کو کسی چیز کے توڑنے اور دوبارہ بنانے سے دلچسپی ہوتی ہے توڑ پھوڑ کے بعد تعمیر کے اسی جذبہ کو ابتدائی تعلیم کے بنیادی اصولوں میں شامل کیا جانا چاہیئے

بچوں کو کسی ایک جگہ کتاب اور قلم لیکر بیٹھے رہنے پر مجبور کرنا ان کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی ماہرین تعلیم مینول ورک کو تعلیم کا ایک جزو قرار دیتے ہیں۔ امریکہ میں اسے پراجیکٹ متھڈ کا نام دیا گیا ہے۔ اور سوویٹ یونین میں اس کو کامپلکس متھڈ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہم تکلی چرخہ اور دیگر دستکاریوں کی مدد سے یقیناً تعلیم دے سکتے ہیں لیکن اس اسکیم کی عمل آوری میں ہمیں بعض دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑیگا سب سے بڑی دقت اور دشواری تو یہ ہے کہ ہمیں اس اسکیم کو چلانے کے لیئے تربیت یافتہ اساتذہ نہیں ملیں گے اگر ہم تکلی ہی کے ذریعہ سارے علوم کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو ہمیں تربیت یافتہ اساتذہ کا ایک گروہ درکار ہوگا۔ میں خود ایک استاد ہوں لیکن اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ میں تکلی اور چرخہ ہی سے سارے مضامین کی تعلیم دوں، تو میرے لیئے بھی یہ بات بڑی صبر آزما بن جائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں اس قسم کی تعلیم کے بارے میں چند کتابیں پڑھ کر اپنا کام چلاؤں۔ لیکن اس تعلیم کے لیئے خاص نصاب بھی تیار کرنا پڑیگا اور اس کے لیئے کچھ وقت درکار ہوگا بعض مضامین ایسے ہیں کہ تکلی ہی کے ذریعہ انھیں پڑھانا ناممکن نہیں۔ کیا ہم ایسے مضامین کو نصاب سے خارج کر دیں۔ اگر ایسا کیا جائے تو ہمارا طریقہ تعلیم ناقص قرار پائیگا۔ ہمیں جس حد تک ممکن ہو تکلی ہی سے تعلیم دینی ہوگی۔ لیکن جہاں یہ بات عملاً

ممکن نہ ہو وہاں دوسرے طریقوں اور وسائل سے استفادہ بھی ناگزیر ہوگا۔ اس اسکیم کے تحت ہمیں کوشش کرنی پڑیگی کہ دستکاری ہی سے بچے کے ذہن و دماغ کو صیقل کریں لیکن اس کے لئے تکلی سے بندھے رہنا بھی نقصان دہ اور مضرت رساں ثابت ہوگا جنہیں دوسری دستکاریوں کے ذریعہ ان مضامین کی تعلیم کا بندوبست کرنا پڑیگا جس کے لئے تکلی سودمند ثابت نہیں ہوتی۔ میں تعلیم کو خودکفیل اور خودمکتفی بنانے کے تعلق سے بھی اپنے خیالات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں اب تک تعلیم کو خودکفیل بنانے کیلئے متعدد ممالک میں تجربے ہوئے لیکن وہ کامیاب نہیں رہے۔ امریکہ میں پروفیسر ڈیوی نے تعلیم کو خودکفالت کا ایک ذریعہ بنانے کی کوشش کی تھی اس کا بھی حلقوں میں بڑے ہی جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا لیکن ڈیوی کو چند سال بعد اپنا مدرسہ بند کرنا پڑا۔ کانفرنس میں ڈاکٹر صاحب کے اس غیر متوقع لب و لہجہ نے بہت سے لوگوں کو مایوس کر دیا اور بالخصوص شریمان نارائن جو ان دنوں بیمار تھے اور جنہوں نے گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کی اسکیم کو آگے بڑھانے کے لئے ذاکر صاحب کا نام تجویز کیا تھا، حیران ہو گئے۔ لیکن گاندھی جی نے جنہیں اپنے نقادوں کو پرکھنے کا ملکہ تھا محسوس کر لیا کہ ذاکر صاحب کی باتیں سو فیصد خلوص پر مبنی ہیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ذاکر صاحب کتنے بڑے ماہر تعلیم ہیں۔ انہوں نے ایک لمحہ کے لئے ان باتوں پر اپنی روایت کے مطابق انتہائی ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا۔ اور ان سے خواہش کی کہ ان کی پیش کردہ اسکیم کے ایسے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالیں جو قابل عمل نہیں ہیں اس کے ساتھ ہی گاندھی جی نے ذاکر صاحب کے اعتراضات کا جواب بھی دیا۔ اور بتایا کہ وہ ایک ایسے نظام تعلیم کو رواج دینے کے حامی ہیں جو پڑھنے والے کے ہمہ جہتی ارتقا کا سبب بن سکے۔ اسے مادی آسودگی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اخلاقی اور روحانی حالت کو بھی بہتر بنا سکے۔ اس کی روشنی طبع کا سامان کرے تو اسے جسمانی محنت و مشقت کی عظمت و تقدیس سے بھی روشناس کرائے گاندھی جی نے انتہائی پرامید لب و لہجہ میں کہا کہ اگر ایسا کوئی نظام تعلیم رائج کیا جا سکے تو انھیں یقین ہے کہ وہ بڑی حد تک خودکفیل بھی ہوگا۔ اور طلبا کو بھی خودمکتفی بنا سکے گا۔

ذاکر صاحب گاندھی جی کی اس وضاحت سے کسی حد تک مطمئن ہو گئے۔ کانفرنس کی کارروائی کے اختتامی مرحلہ پر گاندھی جی کے پیش کردہ مقاصد کی روشنی میں نظام تعلیم کی ترتیب و تدوین کی غرض سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، اور گاندھی جی نے اپنے نقادوں کو ہمنوا بنانے کی خصوصی تکنک سے کام لیتے ہوئے ذاکر صاحب ہی کو اس کا صدر نشین مقرر کیا۔ اور ذاکر صاحب نے توقع کے مطابق اپنی گراں بار ذمہ داری کو بڑی حسن و خوبی سے نبھایا۔ اس امر کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ ان دنوں بنیادی تعلیم کی اسکیم کو " واردھا اسکیم " کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ذاکر صاحب نصاب کمیٹی کے ہر اجلاس میں شرکت کے لیے مقررہ تاریخ پر واردھا پہونچ جاتے۔ اس کمیٹی کے دیگر ارکان آچاریہ ونوبا بھاوے اور مسٹر جے سی کماریا پر مشتمل تھے جب اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو ہندستان ہی کے نہیں بلکہ ساری دنیا کے ماہرین تعلیم کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ نصاب کمیٹی کے ارکان کو واردھا تک کے سفر کے اخراجات خود ہی برداشت کرنے پڑتے تھے یا پھر ناگزیر صورتوں میں ارکان کو ریل کے تیسرے درجہ کا کرایہ دیا جاتا تھا۔ کمیٹی کا پہلا اجلاس نومبر ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوا۔ اسی مہینے میں تیسرے ہفتہ میں دوسرا اجلاس طلب کیا گیا اور ۲ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ذاکر صاحب نے اپنی کمیٹی کی رپورٹ گاندھی جی کو پیش کر دی۔ گاندھی جی بھی حیران تھے کہ اتنی قلیل مدت میں ذاکر صاحب نے یہ رپورٹ کس طرح مرتب کی ہوگی۔

یہ وہ دور تھا جب کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ ان اختلافات کا اثر ذاکر صاحب کی پیش کردہ رپورٹ پر بھی پڑے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے تعلق سے ایک غیر ضروری سیاسی بحث شروع ہوگئی۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ماہرین تعلیم نے اسے بہت پسند کیا۔ یہ ایک بدبختی ہے کہ بنیادی تعلیم کی تجویز کے زبردست محرکین ہی اس اسکیم کی ناکامی ہی نہیں تباہی کا سبب بن گئے۔ جس کا خود ذاکر صاحب نے بھی بعد میں کئی مرتبہ ذکر کیا۔ ذاکر صاحب نے اور ان کے رفقائے کار نے اس اسکیم کی عمل آوری کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ان سے ممکن تھا۔ وہ اپنی رپورٹ پر غرض مند سیاسی گوشوں کی

تنقیدوں سے گھبرائے نہیں بلکہ بڑی ہمت، اور بڑے ہی استقلال سے ان کا جواب دیتے رہے اور انھیں مطمئن کرنے کی امکانی کوشش بھی کی ۔ انہوں نے تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ کے اجلاس میں شرکت کی، اور بورڈ کے ارکان سے خواہش کی کہ وہ تعلیم کی اس نئی اسکیم کو قبول کرلیں ۔ ان کے طرز استدلال نے لیڈی گرانٹ، اور سر جارج سارجنٹ کو بھی اس معاملہ میں ان کا ہمدرد بنادیا تھا۔ انھیں سب سے زیادہ تکلیف اس بات سے پہونچی کہ ان کی رپورٹ پر خالصتاً تعلیمی نقطۂ نظر سے غور کرنے کی بجائے سیاسی اختلافات کے پس منظر میں غور کیا جارہا ہے اور نتیجتاً ایسی تنقیدیں ہونے لگی تھیں جو تعلیمی امور و معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ ذاکر صاحب یہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارے ملک کی سیاست کسی پہاڑ سے نکلنے والے غضبناک دریا کی طرح ہمیشہ اپنی سمت بدلتی رہتی ہے ۔ کوئی سیاسی مسئلہ یکایک ابل پڑتا ہے اور پھر اس کی سطح ساکن ہوجاتی ہے ۔ اس کے برعکس تعلیم نسیم سحر کے جھونکے کی طرح دل و دماغ کو معطّر کرجاتی ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے وہ قومی امور اور معاملات ہی سے متعلق ہوتی ہے جب کہ تعلیم کا تعلق ہمارے خمیر و مزاج کی تشکیل سے ہوتا ہے اس میں تیزی اور تندی کا رجحان نئی نسل کے مزاج و آہنگ میں تیزی اور تبدیلی پیدا کرسکتا ہے تعلیم کا راست تعلق اعلیٰ سماجی تصورات سے ہوتا ہے اور انھیں طلباء کا جزو مزاج بنانا آسان نہیں ہوتا اس معاملہ میں اگر سیاست دانوں کے جوش و خروش سے کام لیا جائے تو ساری نئی نسل گمراہ ہوجاتی ہے ۔ مختصر یہ کہ ذاکر صاحب سیاست کو تعلیم کا تابع تصور کرتے تھے اور انھیں یہ بات سخت ناپسند تھی کہ تعلیمی امور و معاملات کو سیاست سے خلط ملط کیا جائے۔

ہمارے ملک کے ماہرین تعلیم کے ان ارشادات کی روشنی میں ہم اپنے آج کے نظام تعلیم کے بنیادی نقائص کا علاج ڈھونڈھ سکتے ہیں جو بالکلیہ سیاسی شعبدہ بازوں کے اثر میں ہے اور جس میں سیاست تو بہت ہے لیکن تعلیم کا عنصر برائے نام رہ گیا ہے۔

جامعہ ملیہ کے لئے ذاکر صاحب کی مساعی ان کے مضامین، اور ان کی تقاریر نے انھیں ملک کا ایک ابھرتا ہوا دانشور اور ایک منفرد و بے مثال ماہر تعلیم بنادیا ان کے

تعلیمی خطبات کے دونوں مجموعے اور ۱۹۵۸ء کے سردار پٹیل میموریل لکچر، آج بھی ہمارے ملک کے دانشوروں اور ماہرین تعلیم کے لیے، فکر و نظر کی نئی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ تعلیم کے تعلق سے ان کے نظریے پر پروفیسر مجیب، سید عابد حسین اور خواجہ غلام السیدین نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں

"لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا کہ بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں، ہندستان میں زندگی گذارنے اور جامعہ ملیہ، مسلم یونیورسٹی جیسی قومی اور ملی تعلیم گاہوں کے وائس چانسلر رہنے کے بعد ذاکر صاحب سیاست سے بے تعلق رہے۔ سیاسی لیڈر بننے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے ان میں سے اکثر ذاکر صاحب میں بڑے بڑے لیڈروں سے زیادہ موجود تھیں، مردم شناسی، نبض شناسی، مصلحت بینی، شخصیت کی کشش، زبان کی طاقت، جلد فیصلہ کرنے کی قوت مگر ایک تو علمی کی غالب صلاحیت نے انھیں اس طرح باندھ کر جکڑ لیا کہ کسی اور صلاحیت کے آزمانے کا موقع نہ دیا۔ دوسرے اور صفات کے باوجود ان میں ایک صفت یعنی سخت دلی کی اس حد تک کمی تھی کہ سیاسی لیڈری کے میدان میں ان کا کامیاب ہونا بہت مشکل تھا جس کا دل دوسروں کو گراتے ہوئے دکھتا ہو وہ اس اکھاڑہ میں ہر ایک سے چت ہو سکتا ہے۔"

خواجہ غلام السیدین نے انھیں خراج تحسین و آفرین پیش کرتے ہوئے بڑی سچی اور خدا لگتی بات کہی کہ "تعلیم کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے اپنی ذات کے لیے اس کو

اختیار کیا۔ کسی غیر معمولی قابلیت کے شخص کے لیے اس میدان کو پسند کرنا بجائے خود ایک خلاف توقع سی بات ہے کیونکہ اس میں بڑے صبر و ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔"

تعلیم کے بارے میں ان کے کارناموں، تجربات اور نظریات پر تبصرہ کرنا کسی بہت بڑے ماہر تعلیم ہی کے بس کی بات ہے۔ البتہ اس سلسلے میں خود انہوں نے جو باتیں بتائی ہیں وہ یہ ہیں کہ جرمن ماہر تعلیم جارج کرشین اسٹینر سے انہوں نے تدریس کے شریفانہ پیشہ کی اعلیٰ قدروں سے واقفیت حاصل کی اور پھر گاندھی جی کی سنگت اور مشاورت سے قومی نظام تعلیم کی ترتیب و تدوین کا سلیقہ سیکھا۔ کرشین اسٹینر نے تعلیم کے بارے میں کہا ہے کہ "پاکیزہ تہذیبی قدروں کا خوشگوار امتزاج پیدا کرنے کی انفرادی صلاحیت کی نمائندگی کرتی ہے۔" اور ظاہر ہے کہ تہذیبی قدریں معاشرہ کے سائنٹی شعور جمالیاتی ذوق، مذہبی عقائد، روایات، مروجہ قوانین، سماجی آداب، مکتب و مدارس کے علاوہ، بعض شخصیتوں کی دین بھی ہوا کرتی ہیں۔ ذاکر حسین صاحب نے بھی اپنے جرمن استاد کے انداز فکر سے متاثر ہو کر تعلیمیافتہ آدمی کی چند نشانیاں بتائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تعلیم یافتہ آدمی کا ذہنی افق عام آدمی کے مقابلے میں بہت وسیع ہوتا ہے اور وہ ان اقدار کی اہمیت کا اندازہ کرسکتا ہے جو بعض اشیا اور شخصیتوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ وسیع النظر ہوتا ہے اور اس کا ذہن بڑی آسانی سے نئی قدروں کو قبول کر لیتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس میں اخلاقی برگزیدگی کے حصول کی ایک فطری خواہش ہوتی ہے اور کسی وقت بھی یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نے کمال حاصل کر لیا ہے۔ چوتھی صفت جو تعلیم یافتہ شخص کی بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کٹرپن اور ضد نہیں ہوتی۔ ذاکر صاحب کے نقطہ نظر سے پڑھے لکھے اور شائستہ آدمی کی پانچویں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی داخلی انتشار کا شکار نہیں ہوتا۔

تعلیم کے متعلق ذاکر صاحب کے ان نظریات کی روشنی میں گاندھی جی کا یہ اقدام کتنا عاقبت اندیشانہ بن جاتا ہے کہ انہوں نے خود اپنی تعلیمی اسکیم پر ذاکر صاحب کی سخت تنقید کے باوجود ان ہی کو نصاب کمیٹی کا صدر نشین مقرر کیا۔

خواجہ غلام السیدین کے الفاظ میں گاندھی جی کے غیر واضح اور مبہم تعلیمی نظریہ سے ہم آہنگ کوئی نصاب تعلیم مرتب کرنا آسان کام نہ تھا۔ انہوں نے جسمانی کام کو کتابی تعلیم سے جوڑ دینے کی گتھی سلجھا کر کتنے ہی ماہرین تعلیم کو حیران کر دیا نصاب بھی ایسا مرتب کیا کہ بنیادی تعلیم کے تصور کے مخالفین کا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوگا کہ درس گاہیں بھی آہستہ آہستہ چھوٹے موٹے کارخانوں کی شکل اختیار کر لیں گی ـــــ لیکن اس نظام تعلیم کو ٹھیک ڈھنگ سے روبہ عمل لانے والے استاد نہ مل سکے۔ اور نتیجتاً بنیادی تعلیم کے بیشتر مدارس نے چرخہ کاتنے کے مراکز کی شکل اختیار کر لی۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا۔

ذاکر صاحب نے صاف الفاظ میں کہا کہ کانگریس نے اپنے وزیروں کو کسی وقت بھی اپنی تعلیمی پالیسی سے واقف اور روشناس نہیں کرایا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ بنیادی تعلیم اسکیم کو کانگریسی قیادت نے نہ اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اسے ٹھیک ڈھنگ سے روبہ عمل لایا گیا۔ ذاکر صاحب نے اپنے ایک اور تعلیمی خطبہ میں "ورک اسکول" کا خاکہ بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

ان مدارس کے لئے آنے والی اہم شخصیتوں کو اساتذہ
بہت جلد پہچان لیتے ہیں۔ انھیں اندازہ ہو جاتا
ہے کہ ان میں کون بنیادی تعلیم کو تضیع اوقات کے
مترادف سمجھتا ہے اور کون اس سے گہری دلچسپی رکھتا
ہے۔ ان کا یہ اندازہ بڑی حد تک درست اور
صحیح ہوتا ہے وہ معائنہ کرنے والی شخصیت کو
مدرسہ کی کارکردگی سے واقف کرانے کی بجائے
اس کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی تقریب منعقد کرتے
ہیں جس میں مہمان کی گلپوشی کی جاتی ہے

روانی استقبالی نظمیں سنائی جاتی ہیں اور جواب
میں مہمان بھی ایک تقریر جھاڑ دیتا ہے۔ پھر چائے
نوشی ہوئی ہے۔ مدرسہ کے کسی گوشہ میں تکلی
اور چرخہ دھرا ہوتا ہے۔ ایک آدہ طالب علم
اسے چلاتا دکھائی دیتا ہے، اور وہ بھی اس انداز
میں کر دھاگہ بار بار ٹوٹ جاتا ہے۔ طلبا رہی پر کیا موقوف
ہے استاد محترم کو بھی چرخہ چلانا نہیں آتا ہمارے محترم
اساتذہ ایسی کسی بھی نازک صورت حال سے بچنے کے
لئے بالعموم کھادی کا ایک آدہ تھان کسی میز پر جما
دیتے ہیں اور معزز مہمان کو باور کرایا جاتا ہے کہ
طلبا اور اساتذہ نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔"

ہندستانی تعلیمی سنگھ کی کانفرنس میں اپنی چبھتی ہوئی تقریر کے بعد متعدد سوالات کے جواب میں انہوں نے کہا کہ " بنیادی تعلیم اسکیم ناکام رہی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے ایمانداری سے روبہ عمل لایا جائے "

ذاکر صاحب ایک ایسے طریقہ تعلیم کے زبردست حامی تھے جس کا مقصد سماجی شعور کو جلا دینا ہے وہ ایسے تعلیمیافتہ گروہ کے جنم لینے کے منتظر تھے جو شیش محل میں بند رہنا نہیں چاہتا بلکہ عوام سے اپنا ربط ضبط باقی و برقرار رکھتا ہے کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس قسم کے پڑھے لکھے افراد بے فیض اور بیکار ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

فرد کا وجود گروہ یا جماعت کے وجود کا تابع ہوتا ہے
۱۰ر جنوری ۱۹۵۹ء کو کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ
تقسیم اسناد میں ذاکر صاحب نے یہ بھی کہا تھا

"۱۹۴۷ء کے قبل کے دور میں ہماری تمام تر توجہ قومی آزادی کے حصول پر مرکوز رہی اور اس کے نتیجہ میں انفرادی ذمہ داریوں پر سماجی ذمہ داریوں کا غلبہ رہا آزادی کے بعد کے حالات میں مادی آسودگی کی جدوجہد نے زبردست اہمیت اختیار کرلی اور ہمارے پست معیار زندگی کے پیش نظر یہ بات ضروری بھی تھی۔ لیکن اس کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہم اخلاقی اور روحانی اقدار سے بالکلیہ بے نیاز ہو جائیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مادی آسائشیں نظر انداز کر دیئے جانے کے قابل ہوتی ہیں۔ جامعات اور اعلیٰ تعلیم کے مراکز کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انفرادی ضروریات، اور اخلاقی برگزیدگی کے تصورات میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کریں۔ ہمارا موجودہ معاشی اور سماجی موقف کچھ اس درجہ خراب اور ابتر ہے کہ اس پر ساری توجہ مرکوز کرنے کے نتیجہ میں ہم اخلاقی اور روحانی ارتقا سے بالکل بے نیاز بھی ہو سکتے ہیں جامعات کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی کوئی صورت حال پیدا نہ ہونے دیں۔ اچھی اور معیاری تعلیم، انفرادی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی ارتقاء کی راہیں بھی ہموار کرتی ہے۔ ذہن و دماغ بالکلیہ انفرادی ملکیت ہوتا ہے لیکن اُسے

سماج کی صلاح و فلاح کے لئے رد بہ کار لانے والا ہی
صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ آدمی ہوتا ہے۔"

ذاکر صاحب اپنے خالص سیکولر اندازِ فکر کے باوجود، سرکاری مدارس میں دینیات اور اخلاقیات کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں تعلیمی سنگھ کے اجلاس میں انہوں نے سرکاری مدارس میں دینی اور اخلاقی تعلیم کے مناسب انتظام کی ضرورت پر زور دیا۔ ثانوی تعلیم کے مرکزی بورڈ کی خصوصی کمیٹی میں بھی انہوں نے دینی اور اخلاقی تعلیم کی اہمیت پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ لیکن دونوں ہی موقعوں پر ان کی اس تجویز سے اختلاف کیا گیا۔ تعلیمی فلسفہ کے ماہرین بالعموم اچھے استاد ثابت نہیں ہوتے۔ مگر ذاکر صاحب کے بارے میں، بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اندازِ فکر کے مطابق تعلیم کے ایک نئے نظام کو رو بہ عمل لانے کی مخلصانہ اور کامیاب کوشش بھی کی۔ خواجہ غلام السیدین کے الفاظ میں "جامعہ ملیہ کو انہوں نے ہندستان میں پراجکٹ متھڈ کی پہلی تجرباتی درس گاہ بنایا اور اس کے طلباء میں اجتماعی طور پر پڑھنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی طور پر زندگی گذارنے اور جینے کا سلیقہ بھی پیدا کیا۔ انھوں نے طلباء میں حکومت خود اختیاری (سلف گورنمنٹ) کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی، اور انھیں ذمہ دار شہری بننے کی اہلیت عطا کی۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے جامعہ کے طلباء میں سماجی اور قومی شعور پیدا کیا۔ یہ پہلی درس گاہ تھی جس کے طلباء محسوس کرتے تھے کہ حصول تعلیم کا مقصد صرف نوکری حاصل کر لینا نہیں ہوتا۔ تیئس برس تک وہ جامعہ کے وائس چانسلر رہے۔ اور زندگی کے ان ۲۳ برسوں میں انھوں نے کتنی ہی نسلوں کو نئے اندازِ فکر اور نئے افکار سے سنوارا اور انھیں اس قابل بنایا کہ وہ عملی زندگی میں ایک خوددار، غیور، اور کارکرد ہندستانی ثابت ہوں

بٹوارے کے پرآشوب دن

جامعہ کی نشو ونما اور اس کی ترقی میں ذاکر صاحب کا ساتھ دینے اور ہاتھ بٹانے والی شخصیتیں ایک ایک کر کے رخصت ہوگئیں ۔ مولانا محمد علی داغ مفارقت دے گئے ۔حکیم اجمل خاں جدا ہو گئے ۔ڈاکٹر انصاری کتنوں کو روتا چھوڑ گئے اور اس قومی درس گاہ کی تمام تر ذمہ داریاں ذاکر صاحب پر آ پڑیں پرانے رفقاء میں ایم اے خواجہ رہ گئے تھے اور انہوں نے امیر جامعہ کا عہدہ سنبھال لیا ذاکر صاحب نے جامعہ ہی میں بنیادی تعلیم کے اساتذہ کی ٹریننگ کا ایک شعبہ بھی قائم کر دیا۔ جامعہ بتدریج ایک مثالی اور منفرد یونیورسٹی بنتی جا رہی تھی ۔اسے دیکھنے، اور اس کے طریقہ تعلیم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بیرونی دانشور، اور اساتذہ آنے لگے تھے چیانگ کائی شک جب ہندستان آئے تھے تو انھوں نے بھی قومی تعلیم کی اس واحد ہندستانی درس گاہ کا معائینہ ضروری سمجھا۔ جواہر لال نہرو مولانا آزاد اور شیخ عبداللہ اس کے امور اور معاملات میں گہری دلچسپی لینے لگے آہستہ آہستہ اس کا معاشی موقف بھی بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں مولانا عبیداللہ سندھی طویل جلا وطنی کے اختتام پر ہندستان واپس ہوئے اور انہوں نے ذاکر صاحب سے وعدہ کر لیا کہ وہ زندگی بھر جامعہ کے طلباء کو درس دیں گے۔

ہندستان میں ان دنوں سیاسی بے چینی کی ایک ہمہ گیر لہر سی دوڑ گئی تھی اپنی عادت کے مطابق ذاکر صاحب' ہر اہم سیاسی واقعہ کے مضمرات سے طلباء کو واقف کرانے کے لئے جامعہ میں جلسے منعقد کرتے ۔جب کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دیدیا تو ذاکر صاحب نے نوجوانوں ، اور طلباء کو سمجھایا کہ وہ غیر ضروری غم و غصہ کے اظہار سے باز رہیں کیونکہ ان استعفوں سے ملک کو نقصان نہیں بلکہ فائدہ پہونچیگا

دوسری عالمی جنگ کے اسی زمانہ میں پوربندر میں جامعہ کی آپا جان مس

فلیس بورن گرفتار کرلی گئیں ۔ بعد میں انھیں رہا تو کردیا گیا لیکن ان کی صحت بڑی تیزی سے گرنے لگی تھی ۔ بالآخر دہلی کے ایک ماہر سرجن نے ان کا آپریشن کیا اور آپریشن کے بعد پتہ چلا کہ ان کی تمام آنتیں کینسر سے متاثر ہوگئی ہیں توقع کے مطابق چند روز بعد آپا جان چل بسیں ۔ انہوں نے ۱۲ سال تک جامعہ کی بے لوث خدمت کی تھی ۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۳ء تک جب وہ آئی تھیں تو جامعہ کا وجود خطرہ میں تھا لیکن ان کی وفات کے وقت اس کا موقف خاصہ مستحکم تھا ۔ ان ہی بارہ برسوں میں ذاکر صاحب نے بھی کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ۔ انھیں اندازہ تھا کہ جامعہ کی تعمیر و ترقی میں آپا جان کی محبت ، شفقت ، خلوص ، اور قربانیوں کا کتنا دخل رہا ہے ۔ ذاکر صاحب کے لئے ان کی موت ایک سانحہ سے کم نہ تھی لیکن موت کے آگے کسی کی کچھ نہ چل سکی اور آپا جان کے ان گنت بھائیوں نے جامعہ کے احاطہ میں انھیں بادیدہ نم دفن کردیا ۔ آج تک آپا جان کی اس ابدی آرام گاہ پر عقیدت و محبت کے پھول چڑھائے جاتے ہیں

دوسری جنگ ختم ہوئی تو کانگریسی قائدین کی رہائی عمل میں آئی جنھیں جنگ کے دوران گرفتار کرلیا گیا تھا ۔ ان کے جیل سے باہر آتے ہی ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوگیا ۔ اب تو ہر شخص محسوس کرنے لگا تھا کہ ہندستان میں برطانوی سامراج کے قدم اکھڑ رہے ہیں اور وہ چند دنوں کا مہمان ہے اس ہنگامی میں سیاسی اختلاف رائے نے بھی ایک ایسی شکل اختیار کرلی تھی جو ذاکر صاحب جیسے مہذب اور شائستہ انسان کے لئے بیحد ناگوار تھی ۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس قسم کے اختلاف رائے کو بھی ، انفرادی دشمنی اور مخاصمت کے مترادف سمجھا جارہا ہے ۔

سیاسی اختلافات کی اس انتہائی ناسازگار فضاء میں ۱۹۴۶ء میں فسادات پھوٹ پڑے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر سید عابد حسین کے الفاظ میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ذاکر صاحب کے لئے بڑی سخت آزمائش کا زمانہ تھا ۔ یوں تو ہندستان

کے خون میں تحریک آزادی نے ۱۹۱۸ء سے ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حکومت خود اختیاری ملنے کے بعد ہندو مسلمان اہل غرض کے تصادم سے فرقہ واری زہر اس شدت سے پھیلنے لگا تھا کہ ہیجان خون نے زہرباد کی صورت اختیار کر لی۔ ذاکر صاحب اور ان کی جامعہ ملیہ اس زمانہ میں دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا تھی۔ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسیٹ لیں ذاکر صاحب کو پورا احساس تھا کہ اس وقت جب ملک کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا ہے سیاست سب سے اہم جزو بن گئی ہے۔ لیکن معلم کی روح، مجاہد کی روح میں تبدیل نہ ہو سکی۔ دشمنوں کی ملامت اور دوستوں کی محبت دونوں ان کو عملی سیاست میں کھینچنے میں ناکام رہے البتہ ذاکر صاحب نے اپنی سی کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مصالحت کرانے اور ملک کی تقسیم کو روکنے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹائیں۔ اور انھیں آخر تک یہ آس رہی کہ اس کوشش میں کامیابی ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کو پہلی قومی کابینہ میں رکھنے کی تجویز ہے تو انہوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترک کابینہ متحد ہندستان کا اصول مان کر بنے گی، اس وقت وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور یہ وہی کر سکتا تھا۔ جو اقبال کی اصطلاح میں مرد فقیر ہو۔ مگر ظاہر ہے ساحل پر رہ کر طوفان کو روکنے کی سعی کیا کامیاب ہوتی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بڑھتی ہی چلی گئی اور ہندستان کو تقسیم کرنا ہی پڑا۔ جس کے ساتھ ہندستان کے مسلمانوں کے جسم، اور ان کی روح تین ٹکڑوں بھارت، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں تقسیم ہو گئی۔

تقسیم کے اسی المیہ سے چند ماہ پہلے جامعہ کی سلور جوبلی آپہونچی۔ ذاکر صاحب نے اس موقعہ پر "جامعہ کیا ہے" کے زیر عنوان ایک پمفلٹ لکھا۔ اس کتابچہ میں انہوں نے آزاد ہندستان میں مسلمانوں کے متوقع موقف کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے پھر ایک بار جامعہ کے قیام کی غرض وغایت کی وضاحت کی اور بتایا کہ اس درسگاہ

کا نصب العین ہندستانی مسلمانوں کو اسلام کے اصولوں پر ایسی تعلیم دینا ہے، جو ان میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرے۔

گاندھی جی تو شروع ہی سے جامعہ کے اس مقصد کی تائید کر رہے تھے چنانچہ اس پُر آشوب دور میں بھی انہوں نے کہا کہ "جامعہ کو اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک مثالی مرکز بننا چاہیئے۔ اس درسگاہ کو ایک ایسے مکتب کی شکل اختیار کرنی چاہیئے جو غیر مسلم اصحاب کو بھی اسلامی فلسفہ اور شعار زندگی سے واقف کرا سکے۔" ذاکر صاحب نے گاندھی جی کی اس تائید کے سہارے جامعہ فنڈ کی وصولی کی مہم شروع کی اور اس کے لئے انہوں نے ہندستان کے بڑے شہروں کے دورہ کا آغاز کیا۔ وہ سب سے پہلے بمبئی گئے اور وہاں ایک مہینہ تک اپنے قریبی دوست جناب خواجہ عبدالحمید کے مکان میں ٹھہرے رہے خواجہ صاحب اور جامعہ کے گریجویٹ جناب بدرالدین حارث کے تعاون و اشتراک سے انہوں نے شہر بمبئی کے اہل کرم و اہل علم سے دو کروڑ روپے کے عطیے جامعہ کے لئے حاصل کئے بمبئی میں قیام ہی کے دوران ان سے اخباری نمائندوں نے پوچھا کہ ان کی عارضی حکومت میں شمولیت کی خبریں کس حد تک درست ہیں۔ ذاکر صاحب نے صاف الفاظ میں بتایا کہ انھیں ایسی کوئی پیش کش نہیں کی گئی اس لئے وہ افواہوں پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ جون ۱۹۴۶ء میں عارضی حکومت کے ارکان کے ناموں کی جو فہرست کانگریس نے وائسرائے کو پیش کی تھی اس میں ان کا نام شامل تھا۔ جب ذاکر صاحب کو اس بات کی اطلاع ملی تو انہوں نے مسٹر نہرو کو تحریری طور پر مطلع کیا کہ وہ اس وقت تک عارضی کابینہ میں شامل نہ ہوں گے جب تک کہ ان کا نام متفقہ طور پر پیش نہ کیا جائے ذاکر صاحب ایک معلم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے جماعتی سیاست میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ غالباً ان کے اسی رجحان کی بناء پر انہیں عارضی کابینہ میں شامل نہیں کیا گیا چنانچہ ۱۶ / جون ۱۹۴۶ء کو حکومت برطانیہ کی جانب سے اس خصوص میں جو بیان جاری کیا گیا اس میں ذاکر صاحب کا کوئی ذکر نہ تھا۔ مسلم لیگ قوم پرست مسلمانوں کی

کی بدترین مخالف تھی اور ذاکر صاحب کے اصول و انداز فکر کے اعتبار سے یہ بات پسندیدہ نہ تھی کہ وہ ملک کے اقتدار میں شریک ہونے ایک جماعت کے لئے ناقابل قبول نمائندہ کی حیثیت سے عارضی کابینہ میں شامل رہیں۔ ذاکر صاحب کی اس احتیاط پسندی سے ان کے بدترین مخالف مسلم لیگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی تقریب میں کانگریسیوں کے علاوہ مسلم لیگیوں کی بھی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ یہ تقریب ۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء کو نواب صاحب بھوپال کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس میں جہاں ایک طرف مسٹر نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سی راجگوپال چاری اور دیگر سرکردہ کانگریسی قائدین شریک ہوئے۔ وہیں قوم پرست مسلمانوں کے بدترین مخالف مسٹر محمد علی جناح اور ان کی بہن فاطمہ جناح کے علاوہ مسلم لیگی لیڈر لیاقت علی خاں بھی موجود تھے۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے انتہائی موثر تقریر کی۔ ذاکر صاحب نے اس موقع پر جامعہ کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کے مختلف مراحل سے شرکائے جلسہ کو واقف کرایا۔ علی گڈھ کی مسجد کے صحن میں درس گاہ کے قیام کے فیصلہ سے لیکر جامعہ کے پرآشوب زمانہ تک جہد مسلسل کی یہ داستان دراصل ایک مرد مجاہد کے عزائم و حوصلوں کی سرگزشت تھی۔ جب بڑے لیڈروں نے اس سے منھ موڑ لیا، اور ٹرسٹیز کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ذاکر صاحب اور ان کے مٹھی بھر رفیقوں نے کلید جامعہ حاصل کی تو کسی کو یقین نہیں تھا کہ یہ ادارہ اپنا وجود برقرار رکھ سکیگا پھر ہمدردان جامعہ کی تشکیل عمل میں لائی گئی اور اس کونپل پودے کو باد مخالف کے جھکڑ سے بچانے کا تہیہ کر لیا گیا۔ یہ کہانی یوں بھی بہت موثر تھی اس پر ذاکر صاحب کا انداز بیان ـــــ

ع نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز

ذاکر صاحب نے فخر و انبساط کے لب و لہجہ میں کہا کہ بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی جامعہ کو سرکار یا کسی سیاسی جماعت کے پاس رہن نہیں کیا گیا۔ اس کی آزادی فکر پر آنچ نہ آنے دی گئی۔ اس پر کسی خاص مکتب خیال کی چھاپ نہ لگ سکی۔ انہوں نے

شرکائے جلسہ کو جامعہ کے موجودہ وقت سے بھی واقف کرایا اور اس کے مستقبل کے تعلق سے بھی بعض اہم باتیں ان کے گوش گذار کیں۔ اپنی تقریر کے اختتامی حصہ میں انہوں نے جامعہ اور اس کے تعلیمی مسائل کے تذکرہ سے اجتناب کرتے ہوئے ملک کی سیاسی صورت حال کا تذکرہ کیا۔ اور کہا۔

"آپ تو آسمانِ سیاست کے درخشاں ستارے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں آپ نے بڑا اونچا مقام پیدا کر لیا ہے۔ اور آپ کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض امور و مسائل کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو تعلیم کے شعبہ میں کام کرنے والے کارکنوں کے ذہن و خیال پر چھائے ہوئے ہیں۔ نفرت کا زہر بڑی تیزی سے ہمارے جسدِ اجتماعی میں سرایت کرتا جا رہا ہے اور تعلیم کے باغیچے بھی عداوت و خصومت کے شعلوں سے جھلسنے لگے ہیں۔ یہ ملک جو شرافت و انسانیت کا گہوارہ رہا ہے، برائی کی طاقتوں کی آماجگاہ بنتا جا رہا ہے۔ اس دلدل میں محبت و خیر سگالی کے پھول کیسے کھلیں گے؟ ہمارے عوام کا معیارِ زندگی تو جانوروں سے بھی گرا گرا ہے۔ درندوں کی یلغار و یورش سے معصوم دیے گئے شہریوں کو بچانے کی ذمہ داری کون قبول کریگا؟ تلخ نوائی معاف! لیکن حالات نے تو کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے کہ ان کے خطرناک مضمرات کے اظہار

کے لئے یہ الفاظ بھی بہت نرم ہیں۔ درس و تدریس
میں مشغول ہم لوگ جو نئی نسل کے احترام کے حامل ہیں
اور اس کے ذہن کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ یہ سن
کر لرزہ براندام ہوئے جا رہے ہیں۔ شیر خوار بچے
بھی بربریت اور بہیمیت کا شکار ہو رہے ہیں۔
ہمارے اسلاف، دانشور اور شاعر تو کہا کرتے تھے
کہ ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے اور اپنے ساتھ الوہی پیام
لاتا ہے۔ لیکن ہمارے ارد گرد کا ماحول اتنا بھیانک
ہوتا جا رہا ہے کہ نوزائیدہ بچوں کی بھی خیر نظر نہیں آتی
اس کے باوجود انسان کی طبعی شرافت پر سے ہمارا اعتقاد نہیں
اٹھا ہے ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں اور بہ تمام احترام پوچھنا چاہتے
ہیں کہ بھٹکے ہوئے کاروان کو محبت و اخوت
کی راہ پر لانے کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں؟ خدا
کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور نفرت کے بھڑکتے
ہوئے شعلوں کو فرو کرنے کی کوئی سبیل نکالئے
اس صورت حال کی ذمہ داری ایک دوسرے پر
ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اصل سوال تو
اس آگ کو بجھانے کا ہے جو چاروں سمت سے بڑھی
چلی آرہی ہے۔ اس آگ میں کسی ایک فرقہ یا فرد
یا طبقہ ہی کو نہیں سبھوں کو نقصان پہونچیگا۔ اور وہ
سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا جس پر ہم ناز کرتے
آئے ہیں۔ مہذب اور شائستہ زندگی سے

ہمیت پر سر پیکار رہے۔ شائستگی کو سرخ رو و شاد
کام بنانے کا جتن کیجیے۔ خدا کے لئے وہ وقت
نہ آنے دیجیے جب کہ ہمارا قصر تہذیب و ثقافت
کے جلے جلائے ملبہ کی شکل اختیار کر لیگا۔"

ذاکر صاحب کی اس اثر آفریں تقریر نے سبھی قائدین کو آبدیدہ کر دیا۔ مسٹر نہرو تو تصویر غم بنے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سبھی جانتے تھے حالات کس درجہ پر آشوب ہو چلے ہیں۔ لیکن سبھی اپنے آپ کو بے بس ولاچار محسوس کر رہے تھے ایک بڑے المیہ کو روکنے کا دم خم کسی میں نہ تھا۔ ملک کو بڑے ہی عجیب و غریب حالات میں آزادی مل رہی تھی۔ اس کا بٹوارہ ہو رہا تھا اور بٹوارہ بھی سمجھوتہ اور مفاہمت کے ماحول میں نہیں بلکہ تلخی اور کدورت کے جذبہ کے ساتھ!

دلی بھی فرقہ واریت کی آگ سے محفوظ نہ رہ سکی، اور وہ وقت بھی آگیا جب کہ جامعہ کو بھی فسادیوں نے گھیر لیا۔ ایک دن جواہر لال نہرو خود ہی جامعہ پہونچ گئے اور خطرہ کا اندازہ کر کے رات وہیں بسر کی۔ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود جامعہ نگر کی حفاظت کے لئے دو سے زیادہ کانسٹبل نہ مل سکے۔ جمنا کے اس پار گاؤں اور بستیاں فروزاں تھیں اور ان کے شعلے جامعہ نگر سے دکھائی دے رہے تھے سبھی سوچ رہے تھے کہ جامعہ بھی گھنٹے دو گھنٹے کی مہمان ہے۔ اسی اثناء میں ایک دن جنرل کری اپا کی اتفاقاً مولانا آزاد کے سکریٹری مسٹر اٹل سے ملاقات ہوگئی اور مسٹر اٹل نے انھیں بتایا کہ جامعہ کن حالات سے دوچار ہے۔ جنرل کری اپا سیدھے جامعہ گئے۔ اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد جامعہ نگر کے تحفظ کے لئے ایک فوجی دستہ متعین کر دیا۔ لیکن جامعہ والوں کو اطمینان اُسی وقت ہوا جب کہ گاندھی جی جامعہ پہونچ گئے۔ دلی آتے ہی گاندھی جی نے سیدھے جامعہ کا رخ کیا اور اس درس گاہ سے ان کی غیر معمولی دلچسپی نے جامعہ کو بچا لیا۔ جامعہ کے ساتھ ساتھ شیخ الجامعہ ذاکر حسین کی زندگی کے

کے لالے پڑ گئے تھے لوگوں نے انھیں کتنا ہی کہا کہ جامعہ چھوڑ کر کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں لیکن ذاکر صاحب کے لئے جامعہ تو ان کی روح تھی روح کو تباہی اور بربادی کے حوالے کر کے اپنے جسم کو بچانے کی کوئی تجویز انھوں نے قبول نہیں کی۔ وہ ان دنوں بیمار تھے اور کچھ دنوں آرام لینے کے لئے کشمیر جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے دوست احباب نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر انھیں اپنے ارادہ سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ذاکر صاحب ایک دن جالندھر چل پڑے، ان کے ساتھ ان کے ایک ملازم کے سوا کوئی نہ تھا۔ ایک ریلوے آفیسر نے ان کے ملازم سے ان کا نام، اور اتا پتہ معلوم کر لیا۔ ریلوے پلیٹ فارم ہی پر ذاکر صاحب کو وزارت اغذیہ کا ایک افسر ملا، اور اس نے باصرار تمام ذاکر صاحب کو اپنے ڈبہ میں بٹھا لیا۔ یہ آفیسر بے حد شراب پیئے ہوئے تھا اور اس کے ساتھ اس کا لڑکا بھی تھا۔ جو اپنے باپ کی مدہوشی سے بے حد پریشان نظر آرہا تھا۔ جب گاڑی لدھیانہ پہونچی تو ذاکر صاحب یہ جاننے کے لئے ڈبے سے باہر نکلے کہ کیا کوئی گاڑی جالندھر بھی جائے گی۔ انھیں بتایا گیا کہ گاڑی جالندھر ضرور جائے گی اور وہاں ان کی حفاظت کا پورا پورا انتظام بھی ہوگا۔ ذاکر صاحب اس جملہ کے مجرمانہ مفہوم کو سمجھ نہ سکے۔ پلیٹ فارم خالی پڑا ہوا تھا اور ادھر اُدھر دو چار پہلوان ٹہل رہے تھے۔ ذاکر صاحب کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی اس لئے انہوں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے ٹیلیفون پر ربط پیدا کرنا چاہا۔ لیکن قبل اس کے وہ ٹیلیفون کرتے دو چار پہلوانوں نے انھیں گھیر لیا اور ان سے کہا کہ وہ ان کا سامان جالندھر جانے والی گاڑی میں چڑھا دیں گے۔ لیکن ذاکر صاحب نے انھیں تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا لیکن پہلوان سامان چڑھانے پر مصر رہے اور ذاکر صاحب کے ڈبہ میں گھس پڑے شراب میں مست وزارت اغذیہ کے افسر نے ان میں سے ایک کو تھپڑ مار دیا اور پہلوانوں کے لئے مقصد براری کا موقع ہاتھ آگیا۔ انہوں نے ذاکر صاحب، اور وزارت اغذیہ کے آفیسر کے سینوں پر چاقو تان دیئے اور ان کے پاس جتنا روپیہ تھا زبردستی لے لیا

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ ان دونوں سے کہا گیا کہ وہ ان کے ساتھ چلیں ریلوے آفسر مسٹر ہربنس لال کپور جو دور کھڑے سارے واقعات کو دیکھ رہے تھے اس موقع پر خاموش نہ رہ سکے وہ فوراً ذاکر صاحب کی مدد کو پہونچ گئے اور انھیں، اسٹیشن ماسٹر کے حوالے کر دیا۔ ذاکر صاحب کو جس کمرہ میں بٹھایا گیا اس کی نگرانی کے لئے اسٹیشن ماسٹر نے دو ہٹے کٹے لوگوں کو متعین کر دیا۔ جونہی اسٹیشن ماسٹر اپنی ڈیوٹی کے اختتام پر اپنے گھر چلے گئے۔ ان دونوں نے ذاکر صاحب کو اشارہ سے باہر بلایا لیکن ذاکر صاحب انجان بنے رہے اور عین اسی وقت ہربنس لال فوجی افسر کرنل گربچن سنگھ کے ساتھ پہونچ گئے۔ نتیجتاً ذاکر صاحب کو ٹھکانے لگانے کا مجرمانہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ تاہم پہلوانوں اور ان کے ساتھیوں نے کرنل گربچن سنگھ سے خواہش کی کہ وہ ذاکر صاحب اور ان کے ہمراہی وزارت اغذیہ کے افسر اور ان کے لڑکے کو ریلوے کراسنگ پر لے جا کر چھوڑ دیں مگر گربچن سنگھ نے ان کی ایک نہ مانی اور صورت حال پر قابو پا لیا۔ اور ایک با اعتماد شوفر کے ساتھ ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو ایک اسٹیشن واگن میں بٹھا کر اسٹیشن سے باہر نکالا، اس اثناء میں وزارت اغذیہ کے آفیسر کا نشہ، اترنے لگا تھا اسے اب اپنی ماں کی یاد آرہی تھی۔ اس نے ذاکر صاحب سے خواہش کی کہ وہ اسے اپنے ایک دوست کے گھر اتار دیں اور اس افیسر کے یہ دوست ڈسٹرکٹ جج بیدی نکلے جو خود ذاکر صاحب کے زبردست مداح تھے۔ کرنل گربچن سنگھ نے یہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد کہ ڈسٹرکٹ جج بیدی صاحب کے مکان میں ذاکر صاحب کو کوئی خطرلاحق نہ ہوگا انھیں وہیں چھوڑ دیا۔

ذاکر صاحب اور ان کے ہمراہیوں نے ڈسٹرکٹ جج بیدی کی قیام گاہ پر رات بسر کی صبح گربچن سنگھ ان کی خیریت پوچھنے کے لئے آئے۔ اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ دہلی واپس ہو جائیں۔ ذاکر صاحب نے بھی یہی مناسب سمجھا لیکن لدھیانہ اسٹیشن پر پیش آنے والے واقعات نے انھیں بید مغموم اور افسردہ کر دیا تھا ذاکر صاحب کی بجائے

کوئی اور آدمی ہوتا تو یقیناً اس کے دل میں نفرت اور انتقام کی چنگاری بھڑک اٹھتی لیکن ذاکر صاحب کے دل میں انسانیت کی خیر سگالی کا جو جذبہ موجزن تھا وہ بروئے کار آیا اور ان کے دل و دماغ کی پاکیزگی پر پہلوانوں کی بیہودگی کا کوئی اثر نہ ہو سکا۔ انسان کے طبعی نیک سرشت ہونے پر ان کا ایقان اس واقعہ کے باوجود متزلزل نہ ہو سکا۔ لیکن برصغیر ہند پر طاری وحشت و بربریت کی فضا نے انھیں دل برداشتہ ضرور کر دیا تھا۔ لدھیانہ میں ہی جہاں وہ موت کے جنگل سے بچ نکلے انھیں پتہ چلا کہ پاکستان سے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس کچھ اس عالم میں لدھیانہ پہونچ سکا ہے کہ اس کے جسم پر کپڑے تک نہیں تھے اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے والد اور بھائی کو ذبح کیے جاتے ہوئے دیکھا تھا وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ ذاکر صاحب کے ایک اور دوست برج نارائن کو بھی پاکستان میں غیر سماجی عناصر نے ختم کر دیا تھا۔ یہ ساری باتیں ذاکر صاحب کے لئے ناقابل برداشت تھیں چنانچہ انہوں نے اس وقت بادیدۂ نم دعا کی تھی کہ خدا انھیں موت دیدے تاکہ وہ انسان کی شقاوت قلبی اور بے رحمی کے اس قسم کے واقعات کو دیکھ سکیں اور نہ ان کی تفصیلات سننے میں آئے ایک ایسے آدمی کے لیے جس نے ۱۹۴۱ء میں بنیادی تعلیمی کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک ایسے سماج کی تمنا کو اپنا آدرش اور نصب العین قرار دیا تھا جو مساوات برادری و اور بھائی چارے کی بنیاد پر کھڑا ہو۔ بلاشبہ ۱۹۴۷ء کا المیہ موت سے کہیں زیادہ بھیانک ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس وقت ملک کے قائدین سے اپیل کی تھی کہ

"جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں
قوم قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزوروں کو زور آور
کا ڈر نہ ہو۔ غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے
جس میں تمدن، اس کے ساتھ پھل پھول سکے
اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں
کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری

عمر بھر کی محنت کو کوئی ایک سیاسی
طاقت ، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دیگی
ہمارا کام پھولوں کی سیج تو ہے نہیں ۔ اس میں بھی
بہت مایوسیاں ہوتی ہیں ۔ اکثر دل ٹوٹتا ہے
پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا
ڈھونڈیں ؟ ۔ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی
یکدل نظر نہیں آتے ۔ کوئی قدر ، آخری قدر
معلوم نہیں ہوتی ۔ جس میں کوئی سنگت نہیں جہاں سب
مل کر گائیں کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں۔
کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں ۔ کوئی
دکھ نہیں جسے سب بٹائیں ۔ ہماری یہ مشکل
دور کیجیے ۔ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور
دیر نہ جانے کیا دن دکھلائے ۔

ذاکر صاحب ادھیانہ سے دہلی واپس ہوئے تو گاندھی جی کی مساعی سے حالات کچھ سدھرنے لگے تھے ۔ انہوں نے جامعہ کی صورت حال کا جائزہ لیا اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ بٹوارہ کے وار کو برداشت کر سکے ۔ درس گاہ کے متعدد طلباء اور اساتذہ ہندستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے ۔ ملک میں قومی حکومت تشکیل پا چکی تھی ۔ اور یہ بات جامعہ کے مستقبل کے تعلق سے کچھ کم امید افزاء نہیں تھی ۔ اس ادارہ کے وقار و احترام کو متاثر کئے بغیر قومی حکومت سے جو مدد ملنے لگی ذاکر صاحب کو اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا لیکن ان کے قریبی دوست پروفیسر مجیب کا خیال ہے کہ ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی ذمہ داری قبول کرنے سے قبل کے دو سال ان کے لئے بیحد حوصلہ شکن ثابت ہوئے

اور انھیں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ قومی حکومت بھی سابق بدیسی دفتر شاہی کے جال میں الجھی ہوئی ہے جامعہ پر بھی ایک سناٹا اور سکوت سا طاری ہوگیا تھا، اور ان سارے حالات و واقعات کا ان کی صحت پر بہت برا اثر پڑنے لگا تھا۔

علیگڈھ میں

بٹوارہ کی ہنگامہ آرائیوں کے اس دور میں اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ کتنے ہی لوگ، جو وطن دوست اور قوم پرست کہلاتے تھے توازن فکر کھو بیٹھے تھے لیکن مایوسی کے اس اندھیرے میں ذاکر صاحب کے دل میں محبت کی شمع فروزاں رہی مولانا آزاد نے اس "پیکر محبت" کو للکارا، ان سے خواہش کی کہ وہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی ذمہ داری قبول کرلیں۔ ایک دفعہ تو ذاکر صاحب ٹال گئے۔ مولانا نے دوسری مرتبہ خواہش کی کہ ان کے مشورہ کو قبول کرلیں اور اس دفعہ بھی ذاکر صاحب نے بتایا کہ انھیں یہ بات پسند نہیں کہ انھیں علی گڈھ پر مسلط کیا جائے تیسری مرتبہ وزیر اعظم مسٹر نہرو نے ذاکر صاحب سے ربط پیدا کیا۔ اور اب کی دفعہ بھی انھوں نے کچھ اس قسم کا جواب دیا جیسا کہ عارضی حکومت میں اپنے نام کی شمولیت کے سلسلے میں دیا تھا مسٹر نہرو کو ذاکر صاحب نے لکھا کہ وہ وائس چانسلری کے عہدہ کو صرف اسی صورت میں قبول کرینگے جب کہ یونیورسٹی کے ارباب مجاز' باتفاق آراء ان کا نام تجویز کریں۔

یہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں کہ تقسیم ہند سے پہلے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی مسلم لیگ کے قائدین کے زیر اثر تھی اور اسے مسلم لیگ کے حامیوں کا ایک بڑا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ بٹوارہ کے بعد فطری طور پر یہ ادارہ شکوک و شبہات کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ یونیورسٹی کے ارباب مجاز بھی ایک "انجانے خوف" میں مبتلا ہو گئے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت مسلم یونیورسٹی کے لئے کچھ عجیب و غریب سی تھی۔ ذاکر صاحب نیشنلسٹ مسلمان، مسلم لیگی قائدین کے انداز فکر سے اختلاف رکھنے والے۔ دوسری

طرف علیگڈھ سے ان کا خلوص بھی مسلمہ، انہوں نے اس ادارہ کے لئے جو گرانقدر خدمات انجام دی تھیں انھیں فراموش کرنا بھی ناممکن ۔ جامعہ ملیہ کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے بھی علیگڈھ کی صلاح و فلاح ان کے پیش نظر رہتی ۔ ۱۹۲۰ئہ میں اسی علیگڈھ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے انہوں نے علم بغاوت بلند کیا تھا لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ جذبۂ بغاوت، اور ناانصافیوں سے انحراف کا حوصلہ اسی "مدینۃ العلم" کی عطا تھا۔ نتیجتاً زندگی بھر علیگڈھ کے لئے ان کے دل میں بڑا نرم گوشہ رہا۔ ۱۹۵۷ء میں علیگڈھ یونیورسٹی کے خطبۂ تقسیم اسناد کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے اس درس گاہ سے اپنی بے پایاں، اور لازوال محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا

"جناب شیخ (وائس چانسلر) میرا تعارف کرا رہے تھے تو میں سوچتا رہا کہ کیا میں اجنبی ہوں جس کا یوں تعارف کرایا جا رہا ہے ۔ مجھے میر کا وہ، مشہور شعر یاد آ رہا تھا جسے مطابق حال بنانے کے لئے دوسرے مصرعہ کو ذرا بگاڑ دینا پڑتا ہے

ع پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارے جانے ہے

یہ کیسے کہوں "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" کہ گل تو خوب جانتا ہے اس لئے یوں کہوں گا۔

ع "گل بھی خوب جانے ہے ہم کو باغ بھی سارا جانے ہے"

یہیں سے تو میری وہ زندگی شروع ہوئی جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا۔ گہرا تعلق ـــــ نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دلگیر

ہونا بھی سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے تمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا۔ یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی۔ مل جل کر کام کرنا سیکھا اپنی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے۔ پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں۔ اس کی ساری آرزو اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں۔ اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا۔ سوکھے پتوں میں ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے مگر سانچے کوئلہ کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا۔ صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو و نما دے سکنے کے لئے ان میں زندگی کی، تیز و تند ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر سیرت کی تعمیر کے لئے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی۔ خلوت و جلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا۔ یہاں فرمانبرداری سیکھی اطاعت شعاری سیکھی۔ ادب سیکھا۔ بزرگوں کا ادب، ہم جنسوں کا ادب۔ چھوٹوں کا ادب، اور خود اپنا ادب۔ سعادتمندی اور وفا شعاری کے ساتھ، خود اختیار اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو میں آزادی جانا

پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں
سے ٹکراتا پایا تو بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمہ
حیات "سے ارزانی ہوئی ۔ باغی بنے نکالے گئے
دوسری بستی بساتے میں ایک ربع صدی کاٹ دی
مگر اس مادر علمی کے لئے عسول میں کبھی کوئی تلخی
محسوس نہیں کی ۔ بن باس میں بھی دل اسی میں
اٹکا رہا ۔ "

علیگڈھ کے اس "عاشق صادق" کی والہانہ محبّت سے کون انکار کر سکتا تھا وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہ چکے تھے ۔ اکزیکیٹو کونسل اکیڈیمک کونسل اور نہ جانے کتنے ہی شعبئے اور کمیٹیاں تھیں، جن سے وہ وابستہ رہے ۔ کتنے بار طوفان اٹھے اور کتنی ہی مرتبہ ذاکر صاحب کی فراست تدبّیر نے ان کا رخ پھیر دیا۔ ایک دفعہ یونیورسٹی کے ٹیچرس ٹرننگ اسکول کے اساتذہ کے مذہبی اختلافات نے بڑی سنگین اور نازیبا شکل اختیار کر لی ۔ اور یہ مسئلہ بھی اگزیکیٹو کونسل میں زیر بحث آیا اور ہر استاد سے خواہش کی گئی کہ وہ اسلام پر اپنے بھرپور ایقان و اعتماد کا تحریری تیقن دے ۔ کونسل کی صدارت سر شاہ محمد سلیمان کر رہے تھے ۔ انہوں نے ذاکر صاحب سے خواہش کی کہ وہ کوئی ایسی راہ نکالیں جو سبھوں کے لئے قابل قبول ہو ۔ اور ذاکر صاحب نے چند ہی ساعتوں میں ایک ایسا مسودہ تیار کر لیا جس پر کسی گوشہ سے اعتراض کی کوئی گنجائش نہ نکل سکی ۔ اس طرح ذاکر صاحب کے ناخن تدبیر نے ایک ایسی گتھی سلجھا دی جو اساتذہ کے مختلف گروہوں میں کشیدگی کا سبب بن گئی تھی ایک دفعہ اکیڈیمک کونسل اور اکزیکیٹو کونسل کے اختیارات کے مسئلہ نے نزاعی صورت اختیار کر لی اور اس دفعہ بھی ذاکر صاحب نے مفاہمت کی راہ ڈھونڈھ نکالی ۔

علیگڈھ سے اپنی اس وابستگی کے باوجود ذاکر صاحب تقسیم کے فوراً بعد کی نازک صورت حال میں اس کی وائس چانسلری کی ذمہ داری قبول کرنے میں ہچکچاہٹ سی محسوس کر رہے

تھے ، اور وہ چاہتے تھے کہ خود ارباب علیگڈھ ہی انھیں اس بارگراں کو قبول کرنے کی دعوت دیں۔ اور اتفاقاً ذاکر صاحب کی یہ شرط تکمیل پا گئی جب کہ نواب محمد اسمٰعیل خاں کے زیر اثر مسلم لیگیوں نے بھی وائس چانسلری کے لیے ذاکر صاحب ہی کا نام پیش کیا ذاکر صاحب نے جب وائس چانسلری کا جائزہ لیا تو طلبا، اور اساتذہ میں بڑی کشیدگی تھی یونیورسٹی کے رگ و پے میں فرقہ واریت کا زہر بری طرح سرایت کر چکا تھا۔ طلبا حالات سے ناراض اور شاکی تھے۔ بٹوارہ نے بہت سے اساتذہ کو تنگ نظر کر دیا تھا تاہم انھیں یقین دلایا گیا کہ اگر وہ جامعہ کے ہمدرد رہیں تو ان کے حقوق اور مفادات کی حفاظت کی جائے گی۔ یونیورسٹی کا انتظامیہ بھی شدید بحران سے دوچار تھا اور یہ ساری باتیں نئے وائس چانسلر ذاکر صاحب کے لیے ایک چیلنج سے کم نہ تھیں لیکن توقع کے مطابق ذاکر صاحب جلد ہی حالات پر قابو پانے لگے۔ ان کے وائس چانسلر بننے کے چند ہی دنوں بعد غلط خیالات کے حامل طلباء کی جانب سے ایک جلسہ طلب کیا گیا۔ جلسہ کے آغاز پر جب قومی ترانہ پڑھا جانے لگا تو بعض طلباء نے اس پر سخت اعتراض کیا، اور ذاکر صاحب کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر احتجاجاً جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے ذاکر صاحب کو یہ بات بہت بری لگی لیکن انہوں نے اس واقعہ کے محرکات کا فوراً پتہ چلایا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ جلسہ نیشلسٹ خیالات کے حامی طلباء نے منعقد کیا تھا۔ اس کے تعلق سے مسلم لیگ کے حامیوں کا ردعمل یہی تو ہو سکتا تھا۔ ذاکر صاحب واک اوٹ کرنے والے طلبا کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کے مجاز تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ انھیں اندازہ تھا کہ ایسا کوئی بھی اقدام حالات کو مزید ابتر کر دیگا۔ انہوں نے اختیار اور اقتدار سے کام لینے کی بجائے حکمت عملی سے کام لیا۔ اور تقریباً ایک سو طلبا کے ایک گروہ کو قومی ترانہ سنانے کی ٹریننگ دلائی طلباء کے اس تربیت یافتہ گروہ نے مسٹر نہرو کی یونیورسٹی میں آمد کے موقع پر قومی ترانہ پیش کیا اور اتنے پر اثر انداز میں پیش کیا کہ مسٹر نہرو کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ علی گڈھ کے ان پر آشوب دنوں کے بارے میں

ذاکر صاحب کے محبّ صادق جناب رشید احمد صدیقی اپنے مضمون "مردِ کامل" میں لکھتے ہیں کہ علیگڈھ پر بڑا سخت وقت گذر رہا تھا جیسے کسی لرزہ خیز زلزلہ کی زد میں ہو۔ پورے ملک میں اس وقت ذاکر صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا جو اس عظیم علمی تعلیمی، تاریخی اور تہذیبی ادارہ کو بچانے کی بے کراں و بے امان ذمہ داری قبول کرنے کا اہل ہوتا یا اس کی ہمت کرتا۔ آزادی سے چند سال پہلے ہندستانی سیاست نے جو رنگ و رخ اختیار کیا تھا اس سے علیگڈھ شدید طور پر متاثر ہوا تھا اس لئے تقسیم ملک کے کے بعد پورے ملک میں تعصّب و تخریب کے جو عناصر ابھرے علی گڈھ ان کا خاص نشانہ بنا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور کسی کے بس کا نہ تھا جو صورت حال رونما تھی، اور تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی اس میں کیا کرے، کہاں جائے، کیا ہوگا، اور کس سے رجوع کرے علی گڈھ کے چھوٹے بڑے سب دم بخود تھے۔ جو نہ ہونا چاہیئے تھا اس کا ان کو احساس تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار تھے دوسرے جو جانتے تھے اس سے بھی برے بھلے واقف تھے۔ جو نئی ذمہ داریاں عائد ہوئی تھیں ان سے خاطر خواہ عہدہ برآ ہونے پر آمادہ تھے۔ لیکن یہ سب کیسے ہوتا اور کون کرتا یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ ۷۰، ۷۵، سال کی طویل مدت میں اس ادارہ نے جو اچھے اور بڑے کام کئے تھے ان کو محض ایک سیاسی حادثہ کی بناء پر نظرانداز کر دیا جائے، نہ مقتضائے انصاف تھا نہ قرین دانشمندی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات نے ملک کو اس طرح زیر و زبر کر دیا تھا کہ شاید ہی کوئی ادارہ جماعت یا جگہ یا کس و ناکس اس سے متاثر ہونے سے محفوظ رہا ہو۔ علیگڈھ کے لئے جتنی غلط بات یہ تھی کہ وہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ کے منصب کو نظرانداز کر کے سیاست کے شور و شغب میں واقع ہوا۔ اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ ہوتی کہ اس کے بدلے اس کے مٹا دینے کو عمل نیک قرار دیا جاتا۔ ذاکر صاحب نے اس وقت علی گڈھ کی قیادت کی ذمہ داری قبول کر کے اس بات کو واضح طور پر ثابت کر دیا کہ نئی ہندستانی حکومت کا بنیادی مقصد ایک مہذب، ترقی پسند، اور انصاف دوست

معاشرہ کو قائم کرنا ہے اور علیگڈھ کی بقاء اور توسیع کا کام اس مقصد کے حصول میں ایک موثر اور مبارک وسیلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاکر صاحب کا یہ کوئی نیا خیال نہ تھا ان کی پوری زندگی اس مقصد کی نہایت مستند ، روشن اور دلکش تصویر و تعبیر رہی ہے" اور پھر ان کی آمد پر اہل علیگڈھ کی مسرت کا نقشہ بھی رشید صاحب نے یوں کھینچا ہے۔

> "ذاکر صاحب علیگڈھ آ گئے۔ لسان الغیب نے بشارت دی یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان ، غم مخور ، عندلیب باغ حجاز کی دعا پہونچی ، کلی کلی ہوتری گرمی نوا سے گداز اور محسوس ہونے لگا۔ جیسے ہم سب پھر ایک بار اپنی اس کھوئی ہوئی فردوس میں آباد ہیں جس کو اقبال نے آغوش مادر کہہ کر کھوئی ہوئی فردوس سے بھی زیادہ دلکش بنا دیا تھا یہ آنا علیگڈھ اور ذاکر صاحب کے درمیان ایک دیرینہ پیمان وفا کی تجدید ، ایک نئی زندگی کا طلوع اور نئے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم و اعلان تھا شکستہ بال ، دل گرفتہ اور پابستہ مرغان چمن فرط مسرت سے زمزمہ سنج ہو گئے۔"

ذاکر صاحب علیگڈھ آنے سے پہلے ہی بیمار رہنے لگے تھے۔ علیگڈھ پہونچنے کے بعد کام کی کثرت نے انھیں اور زیادہ ناتواں کر دیا۔ لیکن ہنگامہ کے اس حال ماحول میں اپنی صحت و عافیت پر وہ بھلا کہاں توجہ دیتے کچھ دنوں بعد قلب کا دورہ پڑا رشید صاحب کے ساتھ شام کی چہل قدمی کے بعد واپس ہوئے۔ رشید صاحب

مکان کے اندر چلے گئے اور ذاکر صاحب باہر کے کمرہ میں ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر بعد صاحب خانہ واپس ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ذاکر صاحب شیروانی سمیت چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن صاحب خانہ کے بیان کے مطابق "یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ دن میں وہ شیروانی شاید ہی اتارتے ہوں۔ آرام کرنا ہوا تو اچکن سمیت لیٹ رہیں گے۔ اور یہ اندیشہ ہو یا اطلاع اس طرح اٹھ کھڑے ہوں گے جیسے ایمرجنسی وارڈ کے ڈاکٹروں کے آرام کرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کا طریقہ ہے۔ چاہا کہ ادھر اُدھر کی کوئی بات چھیڑوں۔ ذاکر صاحب نے بڑے ہموار اور استوار لہجہ میں فرمایا قلب کا دورہ پڑ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے آخری وقت ہے چاہا کہ آپ کو آواز دوں۔ پھر خیال آیا کہ جلدی کیا ہے جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ آپ بھی آتے ہی ہونگے۔ ذاکر صاحب کے اس اطمینان قلب پر دم بخود رہ گیا۔ موصوف نے بالکل نہیں کہا کہ ڈاکٹر بلایا جائے۔ گھر پر اطلاع کی جائے یا دہاں پہونچا دیا جائے بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ذاکر صاحب پر وہ سب حادثے گذر گئے۔ سوائے زندگی کے آخری حادثہ کے۔ میرا ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب پر چاہے جو گذرتی ہو لیکن بات چیت یا چہرے بشرے

سے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ہر لمحہ کتنے سنگین
امکانات کی زد میں تھے ـــــ "

صبر و تحمل اور بردباری کی ان ہی روایات نے جوان کی سنی پٹھانیت سے میل نہیں کھاتی تھیں ـ ذاکر صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی کے ناسازگار ماحول پر قابو پالیا ـ ان دنوں بھی علی گڑھ یونیورسٹی مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہر گروہ کی خواہش یہ ہوتی کہ ذاکر صاحب اس کا ساتھ دیں ـ لیکن ذاکر صاحب نے ان گروہ بندیوں سے الگ رہ کر علی گڑھ کو ایک نیا جامہ پہنایا اور پھر اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئے تو انہوں نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ یہ ادارہ ہندستان کی قومی زندگی کی تعمیر جدید میں تاریخی رول ادا کر سکتا ہے اور اسی احساس کے ساتھ انہوں نے اس کی وائس چانسلری کی گراں بار ذمہ داری قبول کی ہے' ذاکر صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندستان کے جمہوری اور سیکولر ڈھانچہ میں اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کو بڑا اہم رول ادا کرنا ہے ـ اور علیگڑھ یونیورسٹی انہیں ہندستان کے مختلف عقائد و فرقوں سے وابستہ عوام کو متنوع تہذیبوں کے مشترکہ عناصر سے روشناس کرا سکتی ہے ـ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے تہذیبی تنوع کو برقرار رکھنے کی نئی راہوں کی نشان دہی بھی کر سکتی ہے ـ

سچ پوچھیے تو ذاکر صاحب نے علیگڑھ اور باقی ملک کے مابین ایک موثر اور مستحکم رابطہ کی شکل اختیار کر لی تھی ـ جب بھی علی گڑھ کے بارے میں گمراہ کن خبریں پھیلائی جاتیں' ذاکر صاحب ان کی تردید کر دیتے ـ ایک دفعہ جب آچاریہ ونوبا بھاوے یونیورسٹی آئے تو ذاکر صاحب نے ان کا استقبال کرتے ہوئے اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ ملک کے اس تعلیمی مرکز کو محض افواہوں سے متاثر ہو کر شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے دوسری طرف وہ اس امر کی بھی کوشش کرتے رہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی نئی نسل آزادی ہند کے بعد، رونما ہونے والی تبدیلیوں سے مطابقت پیدا کریں ـ ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا ـ

"ہمارا اولین فرض ہے کہ جامعات سے
متعلقہ قوانین میں جو تبدیلیاں لائی گئی ہیں
ان کو اچھی طرح سے سمجھیں اور علی گڑھ کے دروازے
ان پر بند نہ کریں جیسے آزاد ہندستان کی تہذیبی
اور تعلیمی تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل رہا ہے۔"

انہوں نے توقع ظاہر کی کہ جامعہ ملک کے تعلیمی اثاثہ میں گرانقدر اضافہ کریگا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس درس گاہ کے تعلق سے ہندستان کے ارباب مجاز کو بھی فیاضی کسیر حسی، اور فراخدلی کا عملی ثبوت دینا پڑیگا۔ یہ وہ دور تھا جب کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) قانون بابتہ ۱۹۵۱ء نافذ ہو چکا تھا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ بابتہ ۱۹۲۰ء میں بہت سی تبدیلیاں عمل میں لائی گئی تھیں۔

۱۹۵۱ء کے ترمیمی قانون کے تحت مذہبی تعلیم اختیاری مضامین میں شامل کردی گئی تھی کیونکہ دستور کے تحت کوئی ایسا ادارہ، جہاں مذہبی تعلیم لازمی ہو سرکاری گرانٹ سے استفادہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے ہٹ کر یونیورسٹی کورٹ کے لئے مسلمان ہونے کی شرط بھی برخاست کردی گئی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرح بنارس ہندو یونیورسٹی کے کردار اور انتظامی ڈھانچہ میں بھی تبدیلیاں لائی جارہی تھیں۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء اساتذہ اور مسلمان، سب ہی جمہوری اور سیکولر تبدیلیوں کو قبول کرلیں۔ تاکہ ایک عصری جامعہ کی طرح وہ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔ اور حکومت کی امداد سے محروم نہ ہو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ان دنوں مالی مشکلات میں پھنسی ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب نے ان پر قابو پانے کے لئے جامعہ ملیہ کا نسخہ آزمایا۔

۱۹۵۶ء میں وہ ابن سعود کی دعوت پر ایک وفد کے ساتھ سعودی عرب گئے۔ یہ وفد ان کے علاوہ نواب صاحب چھتاری، کرنل زیدی، ڈاکٹر نجم الدین پر مشتمل تھا ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی خواہش پر ابن سعود نے وعدہ کرلیا کہ وہ جب

ہندستان آئیں تو علی گڈھ یونیورسٹی کا معائینہ کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس وعدہ کی تکمیل کی اوراس درس گاہ کے طریقۂ تعلیم اوراس کے معیار و وقار سے اتنے متاثر ہوئے کہ یونیورسٹی مڈیکل کالج کے لئے انھوں نے دس لاکھ روپیوں کے گرانقدر عطیہ کا پیش کش کیا لیکن ذاکر صاحب نے ان سے خواہش کی کہ یہ عطیہ ان کے حوالے کرنے کی بجائے وہ شاہ سعود رات وزیراعظم کو بھجوادیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور ذاکر صاحب کی یہ حکمت عملی یونیورسٹی کے وقار و اعزاز میں اضافہ کا سبب بنی۔

ذاکر صاحب کو وائس چانسلر بننے کے بعد کے پہلے ہی بجٹ میں خسارہ کا سامنا کرنا پڑا، اور خسارہ بھی بہت بڑا، خازن نے جیسے ہی یونیورسٹی کورٹ میں بجٹ پیش کیا اس پر گرما گرم بحث شروع ہوگئی، اور کورٹ کے ارکان کی بھاری اکثریت نے ملازمین کی تخفیف کے حق میں رائے دی لیکن ذاکر صاحب چپ چاپ بیٹھے رہے اور کافی دیر بعد بولے تو، تخفیف کی تجویز کی مخالفت میں!! انھوں نے کہا کہ بجٹ کا متوازن ہونا ضروری نہیں۔ مجھے یونیورسٹی بند کردینا منظور نہیں لیکن ملازمین کی تخفیف بھی گوارا نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ایک تیسرے درجہ کے ادارہ کی طرح کام کرے ذاکر صاحب کا یہ انداز فکر، اور طریقہ کار، ان کی وائس چانسلری کے دور کا امتیازی نشان بنا رہا۔ علی گڈھ یونیورسٹی کو ان دنوں حکومت سے سالانہ تین لاکھ روپے کی گرانٹ ملا کرتی تھی لیکن ذاکر صاحب کی مساعی سے اس میں قابل لحاظ اضافہ ہوا، اور اسے سالانہ ۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپے ملنے لگے۔ ذاکر صاحب ان لوگوں سے جو یونیورسٹی کے گراں بار عمارت کی تکمیل کو ناممکن سمجھتے تھے اکثر کہا کرتے کہ بھئی بہت سے بڑے کام روپے پیسے کے بغیر بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ذاکر صاحب کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ مسلم یونیورسٹی کے حالات کو سدھارنے میں پوری طرح کامیاب نہ رہے۔ وہ اس درس گاہ کا وقار بڑھانا چاہتے تھے، اس کا معیار بلند کرنے کے

آرزومند تھے۔ لیکن یونیورسٹی کی داخلی گروہ بندیوں نے انھیں اپنے منصوبوں کی عمل آوری کا موقع نہیں دیا۔ اور پھر تنہا ایک آدمی کر بھی کیا سکتا ہے۔ ذاکر صاحب میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں، وہاں ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ایسے لوگوں سے بہت جلد دل برداشتہ ہو جایا کرتے تھے جو اہم باتوں کے تعلق سے بھی سرد مہری روا رکھتے ہیں۔ ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تعلیم کے ذریعہ فکر و نظر میں انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ ایقان متزلزل تو نہیں ہوا لیکن علی گڑھ یونیورسٹی کی صلاح و فلاح کے منصوبوں کی یکے بعد دیگرے ناکامی نے انھیں مایوس کر دیا، اور ایک ایسی منزل بھی آئی جب کہ انہوں نے اصرار کے باوجود اگزیکیٹو کونسل کے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب کہ بیرون ہند کے ایک مصنف نے حضرت محمدؐ پر ایک ایسی کتاب بھارتیہ ودیا بھون سے شائع کرائی تھی جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے تعلق سے بعض قابل اعتراض باتیں درج تھیں۔

توقع کے مطابق اس کتاب کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ اس کتاب کا دیباچہ اس وقت کے گورنر اترپردیش مسٹر کنہیا لال منشی نے تحریر کیا تھا۔ ایجی ٹیشن کرنے والوں نے کتاب کے مصنف کو چھوڑ کر جو ان کی دسترس سے باہر تھا مسٹر منشی کو اپنے غم و غصہ کا ہدف بنایا۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں ان کا پتلا بھی جلایا گیا اور اس ہنگامہ میں پیش پیش رہنے والے یونیورسٹی کے ۲۷ طلباء کے نام خارج کر دیئے گئے۔

یہ اندوہناک واقعہ ذاکر صاحب کی علیگڈھ بیزارگی میں مزید اضافہ کا سبب بنا۔ اس سے ہٹ کر یونیورسٹی کے تحت میڈیکل کالج کے قیام کی تجویز سے ریاستی حکومت کی عدم دلچسپی اور بے تعلقی بھی ذاکر صاحب پر کافی گراں گذری۔ دوسری طرف، ان کی صحت بھی جواب دینے لگی تھی، اور وہ اس موقف میں نہیں تھے کہ اس پر آشوب

دور میں علیگڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکیں۔
تاہم انہوں نے طوفان کو گذر جانے دیا۔ اور جب حالات اعتدال پر آئے تو،
استعفیٰ پیش کردیا۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کی مجموعی مدت ۸ سال کی
رہی پہلی میقات تو صرف دو سال کی تھی لیکن دوسری میقات ۶ سال کی رہی
اگر وہ چاہتے تو تیسری میقات کے لئے بھی ان ہی کو وائس چانسلر مقرر کیا جاتا۔

ذاکر صاحب ــــ پارلمنٹیرین سے گورنر تک ۔

ذاکر صاحب مستعفی ہونے کے بعد جامعہ نگر چلے گئے۔ جہاں کا باغیچہ ان
کا منتظر تھا اور پرانے ساتھی ان کے چشم براہ تھے۔ ان کے پاس اتنی پونجی تو تھی کہ
وہ سکون کی زندگی گذار سکیں۔ علی گڈھ کی وائس چانسلری کے دور میں ان کی تین چوتھائی
تنخواہ غریب اور غیر مستطیع طلباء کے کام آتی تھی استعفیٰ کے بعد بھی انہوں نے اپنا
پراویڈنٹ فنڈ اپنے سکریٹری کے تفویض کردیا اور انھیں یہ ہدایت دی کہ اس سے
غریب اور نادار طلباء کی مدد جاری رکھی جائے۔ وائس چانسلری کے دور ہی میں
ذاکر صاحب سیاست اور قومی امور و معاملات میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لینے لگے
جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک قومی مشن پر وہ امریکہ گئے اور وہیں پر اطلاع ملی کہ انھیں راجیہ
سبھا کا رکن نامزد کیا گیا ہے۔ انھوں نے فوراً ہی صدر نشین راجیہ سبھا کو تحریری طور پر مطلع کردیا
کہ ان کی غیر حاضری کو رخصت تصور کیا جائے۔ چنانچہ ایوان نے ان کی رخصت منظور بھی
کرلی۔ ۱۱ر اگست ۱۹۵۲ء کو رسمی طور پر ان کی دوبارہ نامزدگی عمل میں آئی۔ اور
۲۰۶ اپریل ۱۹۵۶ء کو ذاکر صاحب نے رکن راجیہ سبھا کی حیثیت سے حلف
اٹھایا۔ ذاکر صاحب نے راجیہ سبھا میں ایک اعلیٰ پایہ کے پارلیمنٹیرین کا رول ادا کیا
دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے اغراض و مقاصد پر اظہار اطمینان کے لئے اس
وقت کے وزیر اعظم مسٹر نہرو کی پیش کردہ قرارداد کے تعلق سے ایوان میں انہوں نے

تقریر کی تھی وہ اس بات کی دلیل ہے کہ برسرِ اقتدار جماعت سے وابستگی کے باوجود وہ اس کی خامیوں کی نشاندہی میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ پہلے ترقیاتی منصوبہ کی عمل آوری کے بارے میں جو اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں وہ حد درجہ مشتبہ اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا "عوام کو اس کا علم نہیں کہ ترقیاتی منصوبوں اور اسکیموں کی عمل آوری کے نام سے حکومت کیا کرتی رہی ہے اب جبکہ ہم غریبی جہالت اور اندھیروں کے خلاف جہاد کے دوسرے مرحلہ میں داخل ہو رہے ہیں، ہمیں پہلے منصوبہ کی عمل آوری کے سلسلے میں سرزد ہونے والی خطاؤں اور فروگذاشتوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے ملک کے عوام ہماری اس دوسری خطا کو معاف نہیں کریں گے۔ دوسرے ترقیاتی منصوبے کے مسودہ کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ اس میں سرکاری شعبہ کو خانگی شعبہ کے تابع کر دیا گیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ سوشلزم پر یقین رکھنے والا کوئی شخص خانگی شعبہ کی سرکاری شعبہ پر ترجیح کے اصول کی تائید نہیں کر سکتا۔ ذاکر صاحب نے بڑے پتہ کی بات کہی تھی ــ ہندستان کی معاشی پسماندگی کے پیش نظر اس کے سرمایہ کار، اور سرمایہ داروں کو بھی پسماندہ اور سادہ لوح قرار دینا مناسب نہیں تھا۔ وہ بھی ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے غرض مند طبقات کی طرح اپنے مفادات سے خوب واقف ہیں اور سوشلسٹ سماج کی راہ میں ان کا حائل ہونا یقینی ہے ہمیں ان کی چالوں سے چوکس اور ہوشیار رہنا پڑے گا۔"

تعلیم کے نصاب، مروجہ طریقۂ تعلیم، اور دوسرے منصوبہ میں تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے مہیا کردہ رقمی گنجائش پر ذاکر صاحب نے تو بڑی سخت تنقید کی اور ان کی اس تنقید پر اس وقت کے نائب وزیر منصوبہ بندی مسٹر ایل این مشرا وزیر فینانس مسٹر ٹی ٹی کرشنا چاری اور خود وزیر اعظم نہرو کو ان کے اٹھائے ہوئے نکات پر غور کرنا اور ان کا جواب دینا پڑا۔ یہ تو سنہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے اس سے بارہ برس پہلے سرکا کا بھائی پریم چند ریڈر شپ

سلسلہ تقاریر میں حصہ لیتے ہوئے ذاکر صاحب نے منافع کی بنیاد پر قائم معاشی ڈھانچہ کو یکسر بدل دینے کا مطالبہ کیا تھا، اور یہ بھی کہا تھا کہ منصوبہ بند سوشلسٹ معیشت ہی عوام کو ضروریات کی تکمیل کے امکانات پیدا کر سکتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی مخلوط معیشت میں محدود اور جکڑی ہوئی سرمایہ داری کے تعلق سے ان کے اس جملہ کا آج تک بھی اعادہ کیا جاتا ہے۔

> "مخلوط معیشت میں سرمایہ داری کو ایک ایسے بوڑھے آدمی کی طرح زندہ رہنا پڑے گا جسے اپنے ماضی کے گناہوں پر ندامت ہو، اور اپنے عہد جوانی کی لغزشوں کی تلافی اپنے عمل سے کرنا چاہتا ہو۔"

یونیسکو میں ہندستانی وفد کی قیادت

علی گڑھ سے جامعہ نگر کو واپسی کے فوراً بعد ہی مولانا آزاد نے ذاکر صاحب سے خواہش کی کہ وہ یونیسکو میں ہندستان کی نمائندگی کرنے والے وفد میں شامل ہو جائیں جس کی کانفرنس دہلی میں طلب کی گئی تھی۔ خود مولانا آزاد کانفرنس میں شریک ہندستانی وفد کے لیڈر تھے۔ لیکن وہ کانگریس کے ایک ہی اجلاس میں شرکت کر سکے بقیہ تمام نشستوں میں ذاکر صاحب ہی کو ہندستانی وفد کی قیادت کرنی پڑی وہ کانفرنس کے مندوبین کی پسندیدہ شخصیت بن گئے اور انھیں یونیسکو کے اکزیکیٹو بورڈ کا رکن چن لیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ذاکر صاحب کے مراسم اور تعلقات کے متعلق پروفیسر مجیب نے اپنی نئی کتاب میں بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو ذاکر صاحب کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ پروفیسر مجیب

ذاکر صاحب کے رفیق کار ہی نہیں بلکہ ان کے قریبی دوست تھے اس لیے ذاکر صاحب کے بارے میں ان کے تاثرات وارتسامات کو نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ مولانا آزاد کی انفرادیت فکر، اکثر موقعوں پر مسٹر نہرو کے نقاط نظر سے ہم آہنگ نہ ہوتی تھی۔ بنیادی طور پر مولانا ایک جداگانہ شخصیت کے حامل تھے۔ اور دیگر قومی قائدین سے ان کے راوبط، اور تعلقات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی اس جداگانہ شخصیت پر نظر رکھی جانی چاہیئے۔ پروفیسر مجیب کے سوا کسی اور دانشور کی کتاب یا کسی مضمون میں ایسا کوئی حوالہ نہیں ملتا جس کی بنائے پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ مولانا آزاد کسی اہم قومی مسئلہ پر ان سے شدید قسم کا اختلاف رکھتے تھے۔

یونیسکو کانفرنس کے وفد کے رکن کی حیثیت سے ذاکر صاحب کا انتخاب تو اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا آزاد تعلیمی اور تہذیبی امور کے تعلق سے ذاکر صاحب کے زاویہ نگاہ کو قدر و احترام کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ یونیسکو کے اکزیکٹو بورڈ کے رکن کی حیثیت سے انھیں بورڈ کے پیرس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی جس کی دو بیٹھکیں چھ ہفتوں کے وقفہ سے منعقد ہونے والی تھیں۔ پہلی بیٹھک کے اختتام پر ذاکر صاحب کچھ دنوں کیلئے جرمنی چلے گئے اور جرمنی میں چند دنوں کا قیام ان کی صحت کے لیے بیحد مفید ثابت ہوا۔

اسی زمانہ میں انھیں وزیراعظم مسٹر نہرو کا ایک مکتوب ملا جس کے ذریعہ انھیں ریاست بہار کی گورنری کا پیش کش کیا گیا تھا۔ توقع کے مطابق ذاکر صاحب نے عہدہ قبول کرنے میں تامل کا اظہار کیا — اور وزیراعظم سے معذرت چاہتے ہوئے انھیں لکھا کہ ان کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی سرکاری عہدہ کی ذمہ داری قبول کر سکیں ذاکر صاحب کو یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ یونیسکو بورڈ کی دوسری بیٹھک میں شرکت کیئے بغیر ہندستان واپس ہوجائیں۔

پنڈت نہرو بھانپ گئے کہ ذاکر صاحب بڑی خوش اسلوبی سے ان کی بات ٹالنا چاہتے ہیں

انھوں نے ذاکر صاحب کو لکھ بھیجا کہ، گورنری کے عہدہ کا فوراً جائزہ لینا ضروری نہیں ان کی پیرس سے واپسی تک انتظار کیا جا سکتا ہے رہ گئی صحت و عافیت کی بات سو مسٹر نہرو نے انھیں بتایا کہ ان کے لئے گورنر کے عہدہ کا انتخاب محض اس لئے کیا گیا ہے کہ انھیں آرام لینے، اور قدرے اطمینان سے علاج معالجہ کا موقع مل جائے۔ بہر حال ذاکر صاحب کو مسٹر نہرو کا پیش کش قبول کرنا پڑا۔ وہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک بہار کے گورنر رہے اس اثناء میں انھیں اپنے ادبی ذوق کی تسکین کا موقع مل گیا۔ تاہم سرکاری فرائض کی تکمیل کے لیے انھیں کافی وقت دینا پڑتا تھا۔ دستور ہند کے تحت گورنر متعلقہ ریاست کا دستوری سربراہ ہی نہیں بلکہ صدر جمہوریہ ہند کا نمائندہ بھی ہوتا ہے، وہ پندرہ، پندرہ دن، کے وقفہ سے مرکزی حکومت کو ریاست کے متعلق تفصیلی رپورٹ بھیجا کرتا ہے اور اس کی نقل متعلقہ ریاست کے چیف منسٹر کے پاس بھی بھجوائی جاتی ہے۔ اُسے بعض راز کی رپورٹیں راست صدر جمہوریہ کو روانہ کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے اور ایسی رپورٹوں کی نقلیں متعلقہ چیف منسٹر، کے پاس روانہ نہیں کی جاتیں۔ ذاکر صاحب کو اپنی گورنری کے دور میں، ایک یا دو مرتبہ، اس قسم کی راز کی رپورٹیں راست صدر جمہوریہ کو روانہ کرنے کی ضرورت بھی پیش آئی۔ اپنی گورنری کی میعاد کے اختتامی مرحلہ پر، وہ دہلی گئے، تو مسٹر نہرو نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ نائب صدر جمہوریہ ہند کا عہدہ قبول کرنے پر آمادہ ہیں اس امر کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ اس منصب جلیلہ کے لئے جن شخصیتوں کے نام زیر غور تھے ان میں خود مسٹر نہرو کی بہن شریمتی وجے لکشمی پنڈت کا نام بھی شامل تھا ہمارے دستور کے تحت نائب صدر جمہوریہ راجیہ سبھا کا صدر نشین بھی ہوتا ہے اور اس لئے بہ اعتبار عہدہ، نائب صدر، راجیہ سبھا کا اسپیکر ہوتا ہے۔ لیکن اسے اسپیکر کی بجائے صدر نشین راجیہ سبھا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ جہاں امریکہ کے نائب صدر کے لئے ضروری ہے کہ صدر جمہوریہ سے اس کے مراسم و تعلقات بے حد خوشگوار رہیں، وہاں ہمارے نائب صدر جمہوریہ کے وزیر اعظم سے خوشگوار تعلقات

بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ذاکر صاحب اس اعتبار سے بڑے خوش قسمت رہے کہ خود وزیر اعظم مسٹر نہرو، نے انھیں نائب صدارت کا پیش کش کیا تھا۔ اور صدر جمہوریہ مسٹر ایس رادھا کرشنن بھی انھیں بڑے قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ مسٹر نہرو سے ذاکر صاحب بے حد متاثر تھے۔ ان دونوں کے انداز فکر کی نزاکت نے انھیں زندگی بھر، ایک دوسرے کا مخلص دوست بنائے رکھا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی ایک استاد اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کو بہت عزیز تھے۔

نائب صدر جمہوریۂ ہند

ذاکر صاحب کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ نائب صدر جمہوریۂ ہند کے منصب پر ان کا انتخاب ان کی تعلیمی خدمات کی بناء پر ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۵ رجون ۱۹۶۲ء کو راجیہ سبھا میں ان کے انتخاب پر اظہار مسرت کرتے ہوئے متعدد ارکان نے جن خیالات کا اظہار کیا اس کے جواب میں ذاکر صاحب نے بڑی صفائی سے اس کا اعتراف کیا کہ نائب صدر جمہوریہ کے عہدے کیلئے ان کا انتخاب خود ان کے لئے غیر متوقع تھا۔ ان کے بیان کے مطابق وہ خود حیران تھے کہ آخر اس سلسلہ میں ان کی کن خصوصیات کو پیش نظر رکھا گیا ہے اسی اثناء میں ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد کے ہزاروں خطوط، اور برقیئے مل چکے تھے جن میں اکثریت ایسے خطوط اور برقیوں کی تھی جو اساتذہ کی جانب سے بھجوائے گئے تھے۔ ذاکر صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں ان مبارکبادیوں کے حوالہ سے کہا کہ

> "میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ تدریس کے شعبہ سے میری وابستگی ہی میرے انتخاب کا سبب بنی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے

ملک کے لوگ اب بھی گرو، اور استاد کے احترام
کی روایت سے منحرف نہیں ہوئے ہیں۔ "

اس تاریخی تقریر میں ذاکر صاحب نے تعلیم و تدریس کے تعلق سے اپنے نکتہ نظر کی وضاحت بھی کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تعلیم دراصل جمہوریت کے جسد کی شہ رگ ہوتی ہے اور اسی سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم کتنے عظیم تاریخی ورثہ کے حامل ہیں۔ ان کی رائے میں علم کی روشنی ہی ہمیں اپنے نصب العین سے ہمکنار کر سکتی ہے اور وہ جرأت و ہمت عطا کر سکتی ہے کہ مستقبل کو ہم اپنی پسند، اپنی تمناؤں اور اپنی امنگوں سے ہم آہنگ کر سکیں۔ ذاکر صاحب کو اندازہ تھا کہ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں تعلیم، مدارس کالجوں اور جامعات کی چاردیواری میں محدود نہیں رکھی جا سکتی وہ چاہتے تھے کہ اجتماعی زندگی کے تمام شعبے درسگاہوں کے فرائض بھی انجام دیں ان کی خواہش تھی کہ پارلیمنٹ بھی ایک دانش گاہ کی حیثیت اختیار کرے اور قومی مقاصد کے تعین میں نائندین اور عوام دونوں ہی کی رہنمائی کرے۔

ذاکر صاحب کو نائب صدر جمہوریہ کی حیثیت سے پروٹوکل کے آداب کی پابندی بڑی گراں گذرتی تھی بیرونی شخصیتوں سے تکلف سے ملئے، دعوتیں دیجیے، تقاریر کیجیے۔ تصنع کا یہ ماحول ان کے افتادِ طبع سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ ایک موقع پر تو انہوں نے تقاریر کی بھرمار سے بیزار گی، اور سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا

" ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں تقاریر
کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہے۔ ان سے
بچنے کی لاکھ کوشش کیجیے لیکن مفر نہیں
خطابت و تقاریر کی اس بہتات کا نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ کئی جلسوں میں مقرر ایک ہی
بات کا اعادہ کرتا رہتا ہے۔ اس تکرار

کو کیسے روکا جائے۔ کوئی آدمی کہاں تک
نئی باتیں سنائے جائے گا۔ تاہم کچھ لوگ
ہیں جو ایک دن میں متعدد تقاریر کرتے ہیں
اور انھیں اس بات کا کوئی اندازہ نہیں
ہوتا کہ ان کی ہر تقریر سیاق و سباق اور خیالات
و افکار کے اعتبار اور الفاظ کے
اعتبار سے بھی دہرائی ہوئی اور باسی ہوتی ہے "

ذاکر صاحب اپنی تقاریر کو بور بننے نہیں دیتے تھے اور اگر کسی تعلیمی مسئلہ پر اظہار خیال کر رہے ہوں تو حاضرین بت بنے، ان کی تقریر سنتے جاتے وہ فی البدیہہ تقریر کرنے کے عادی نہیں تھے۔ ہمیشہ اپنے خیالات ضبط تحریر میں لاتے اور اس اعتبار سے ان کی تقریر کافی فکر انگیز ہوتی ان کی کوشش یہ ہوتی کہ سامعین کی دلچسپی میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ نئی دہلی میں یونسکو کے زیر اہتمام ۲۹ ر ستمبر ۱۹۶۶ء کو منعقدہ نہرو راونڈ ٹیبل کانفرنس میں ذاکر صاحب کی تقریر ان کے تبحر علمی، اور ان کی ذکاوت و ذہانت کی ایک بہترین مثال ہے۔ انھوں نے مسٹر نہرو کے بارے میں کہا کہ۔

" وہ نہ تو کسی خاص نظریۂ کے پابند تھے نہ ہی کسی
مخصوص زاویۂ نگاہ یا فلسفہ کو ان کے نام سے
موسوم کیا جاسکتا ہے۔ اپنے ہموطنوں کو انہوں نے
تازگی ذہن و فکر کا راستہ دکھایا۔ اپنے ورثہ
میں وہ کوئی نظریہ نہیں چھوڑ گئے۔ کیونکہ وہ
سمجھتے تھے کہ کسی خاص نظریۂ کی چھاپ دماغ
میں افکار تازہ کے داخلے کا دریچہ بند کر دیتی ہے
زندگی بھر وہ آزاد رو رہے۔ لیکن ان کی آزاد

مشرقی نے زندگی کے سلیقہ پر کوئی برا اثر نہیں چھوڑا
ان کی حیات عمل پیہم کی ترجمانی کرتی ہے۔ اچھے
مقاصد کے حصول کے لیے سعی ان کا نصب العین
تھا اور ان کی یاد تازہ رکھنے کا واحد طریقہ
یہی ہے کہ ان کے اس نصب العین کو ہم بھی
اپنائیں ـــــ"

ان کی ہر تقریر ان کے صفائی قلب کی آئینہ دار ہوتی وہ اپنی بات کو پیچ دار الفاظ میں گنجلک بنانے کے عادی نہیں تھے بمبئی میں یوسف مہر علی سنٹر کی رسم افتتاح انہوں نے انجام دی اور اس موقع پر ایک ایسی تقریر کی جو عقائد و مذہب کے نازک معاملہ سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اس دفعہ بھی ذاکر صاحب "کا کھرا پن" مصلحتوں کا پابند نہ رہ سکا۔ انہوں نے کہا کہ۔

"میں یوسف مہر علی کو ایک سچا اور مخلص ہندستانی
مانتا ہوں۔ میں انھیں ہندو نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ
وہ ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھیں
مسلمان کہنے کا بھی مجھے کوئی حق نہیں پہونچتا
کیونکہ وہ سرے سے مذہب ہی کے قائل نہیں
تھے۔ لیکن یوسف مہر علی ایک اچھے اور نیک مسلمان
کی کسوٹی پر بہر حال پورے پورے اترتے ہیں۔ میری
زبان میں اتنی لطافت و چاشنی نہیں کہ میں موزوں الفاظ
میں ایک نیک اور اچھے مسلمان کا سراپا پیش کر دوں
البتہ میں اس تعلق سے بعض موٹی موٹی باتیں ضرور
کہہ سکتا ہوں جو ایک اچھے اور نیک مسلمان کی

پہچان ہوتی ہیں اچھے اور نیک مسلمان کی بہت
پرانی تعریف یہہ ہے کہ اس کی وسیع النظری
فیاضی اور سیر چشمی سمندر کی طرح بیکراں ہوتی ہے
اس کا خلوص دوسروں کے دلوں کو گرماتا ہے
وہ امداد کے طلب گاروں کا ہاتھ بلا تامل پکڑ لیتا ہے
بے سہاروں کا سہارا بن جاتا ہے، دوسروں کے
دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتا ہے وہ مصیبت زدوں
کے مصائب و آلام کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ جو لوگ
اس سے برائی بھی کرتے ہیں، وہ اس کے ساتھ
مہربانی روا رکھتا ہے ــــ یاروں کا یار ــــ
دوستوں کا دوست ــــ "

ذاکر صاحب کی پوری زندگی ان کے اس معیار انسانیت و شرافت کی ترجمانی کرتی ہے جسے انہوں نے مرد مومن کی شناخت اور پہچان قرار دیا تھا خواجہ غلام السیدین کے الفاظ میں۔

"ان کی زندگی کا مرکزی نقطہ نظر تلاش کمال کا
ایک شدید جذبہ تھا، وہ صرف ان کے کاموں
میں ہی نہیں بلکہ ان کی ذات کے ہر گوشہ میں ایک
قندیل کی طرح روشن تھا۔ ان کی تقریریں کبھی
جھول نہ ہوتا۔ ان کی تحریر میں کبھی الفاظ کی یورش
خیال کی جگہ نہ لیتی، بلکہ لفظ ان کے شریفانہ خیالات
اور جذبات کا جامہ پہن کر نازل ہوتے ــــ "

۲۴ ستمبر ۱۹۶۴ء کو جب کہ ذاکر صاحب، نائب صدر جمہوریہ ہند کے عہدہ پر فائز تھے

ہمارے ملک کے ایک سرکردہ دانشور ڈاکٹر کیول دھیر کو ان سے ملاقات اور بعض مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا تھا۔ وہ ذاکر صاحب سے ملاقات کا وقت ان کے سکریٹری مسٹر پھڑکے سے مقرر کرا چکے تھے لیکن احتیاطاً دس منٹ پہلے ہی نائب صدر جمہوریہ کی کوٹھی پہ پہونچ گئے ڈاکٹر کیول دھیر نے ملاقاتیوں کے رجسٹر میں اپنے دستخط ثبت کئے اور کوٹھی کے ایک بڑے کمرہ کے اس گوشہ تک بڑھ آئے جہاں شلف میں لاتعداد کتابیں دھری تھیں، وہ ایک کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہی تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ۔ "چلے آئیے مسٹر دھیر" اور مسٹر کیول دھیر کو کیا پتہ تھا کہ نائب صدر جمہوریہ ہند، مقررہ وقت سے سات منٹ پہلے ہی اپنے مہمان کے استقبال کے لئے ملاقاتیوں کے کمرہ میں چلے آئیں گے ۔ انہوں نے سمجھا پھڑکے صاحب ہیں لیکن جب آواز دینے والے کی طرف متوجہ ہوئے وہ خود ذاکر صاحب تھے ـــــ ہونٹوں پہ سنجیدہ مسکراہٹ لئے !! غیر رسمی انداز میں بات چیت کرنے لگے اسی اثناء میں مدراس کے ایک جوتشی سے بھی ڈاکٹر کیول دھیر کو ملایا جو آئے تو تھے، اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر سروے پلی رادھا کرشنن سے ملنے ۔ لیکن جب پتہ چلا کہ صدر جمہوریہ دہلی سے باہر گئے ہوئے ہیں تو نائب صدر جمہوریہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا جوتشی صاحب میرا ہاتھ دیکھنا چاہتے تھے لیکن میں کمبخت جوتش پر بھروسہ نہیں رکھتا ۔ انھیں ہاتھ دکھا کر کیا کروں ـــــ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ جو لوگ ہر بات کے لئے دوسروں کی محنت کوشش، اور بھروسہ پر زندہ رہتے ہیں وہی لوگ جوتش کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں ۔ تقدیر کوئی چیز ضرور ہے لیکن یہ بھی تدبیر ہی سے بنتی ہے اور بے تدبیری سے بگڑ جاتی ہے ۔

ڈاکٹر تارا چند کے الفاظ میں جمہوریۂ ہند کی نائب صدارت قانونی اور انتظامی فرائض کا ایک عجیب وغریب مجموعہ ہے ۔ نائب صدر جمہوریہ راجیہ سبھا کا صدر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا آرائشی عہدہ دار بھی ہوتا ہے جس کا کام صدر کی عدم موجودگی میں اس کی نیابت کرنا بھی ہے ۔ ذاکر صاحب نے جن دنوں نائب صدر جمہوریۂ کی خدمت سنبھالی اس وقت

کا سیاسی ماحول بڑا صبر آزما تھا۔ راجیہ سبھا ' ہمیشہ موجیں مارتے ہوئے سمندر" کا نقشہ پیش کرتی۔ عام طور پر شور و غل، غصے، نفرت اور شکوک و شبہات کے طوفان آتے اور کبھی تو اس کی لہریں اتنی قد آور اور بلند ہو جاتیں کہ سارا ایوان ان کی لپیٹ میں آجاتا۔ مختلف طبقوں، اور پارٹیوں کے نمائندوں کے نظریات میں تصادم، اثرات و دلائل کی کشاکش کے ساتھ ذاتی اور شخصی حملے بھی!

اس بحرانی دور میں ہندستان کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے کئی تضادات ابھر کر منظر عام پر آنے لگے تھے ماضی و مستقبل کی چپقلش، حال کی بے بسی، پرانی اور از کار رفتہ قدروں کے تحفظ کی سعی لاحاصل، نئی قدروں کی یلغار، نئے ریائے طبقات کے ابھرنے کی خواہش، مفادات حاصلہ کے نمائندوں کو پیچھے ڈھکیلنے کا جذبہ!! ان ساری باتوں نے لوک سبھا اور راجیہ سبھا دونوں ہی کو سیاسی دنگل کا روپ دیدیا تھا

"صدر نشین ہر وقت چوکنا رہتا ـــــ اور کبھی کبھی وہ خود بھی بعض ممبروں کے ساتھ رسہ کشی میں مبتلا ہو جاتا۔ برہمی کو ختم کرنے، اور گرم فضاء کو پرسکون بنانے میں وہ اکثر کامیاب رہتا۔ مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کو سمجھاتا۔ ان سے بہتر رویہ اور طریقہ کار کا مطالبہ کرتا۔ کبھی کبھی منت سماجت پر بھی اتر آتا لیکن ہٹ دھرم اور ہنگامہ خیز مقرر ہے کہ چپ ہی نہیں ہوتا۔ بولے ہی چلا جاتا ہے صدر کی ایک نہیں سنتا، اور اس کے بعد بس قیامت کا سماں آجاتا۔ چیخ و پکار شروع ہو جاتی لوگ بولنے لگتے، اور پورے جسم سے بولنے لگتے۔ کچھ ممبر ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے، اور ایک دوسرے

پر الزام دھرنے لگتے۔ اور پھر آرڈر، آرڈر کی صدائیں بلند ہونے لگتیں ——"

اس ہنگامہ کا تصور کیجیے اور خاموش مرنجاں مرنج ذاکر صاحب کے بارے میں سوچیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی افتادِ طبع سے میل نہ کھانے والی اس صورتِ حال کا ذاکر صاحب نے بڑی جرأت و ہمت سے سامنا کیا۔ اس سے ان کے ذہنی سکون میں کبھی کبھی خلل ضرور پڑ جاتا تھا۔ لیکن صدارت اور ایوان کے وقار کو بہر حال پیشِ نظر رکھتے۔ ڈاکٹر کیول دھیر نے نائب صدر جمہوریۂ ہند کو اپنی قیام گاہ میں جتنا سادگی پسند پایا تھا راجیہ سبھا کی کرسی پر آتے ہی پُر وقار نظر آئے۔ انہوں نے اپنی صدارت کے دور میں کسی رکن کو خواہ وہ کسی جماعت سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ ایوان کا وقت ضائع کرے، چنانچہ وہ جب اس عہدہ —— سے سبکدوش ہوئے تو ایوان کے سبھی ارکان نے بیک زبان ان کی غیر جانبداری، ان کے تحمل اور ان کی بردباری کا اعتراف کیا۔

یہ صورت تو نائب صدارت کی ذمہ داری اور عہدہ کا ایک پہلو تھی جسے آرائشی اور نمائشی "Decorative" پہلو کہا جانا چاہیے۔ وہ ذاکر صاحب کے خمیر و مزاج سے ہم آہنگ نہ تھا۔ آنے جانے والوں کا ہجوم، پروٹوکول کے آداب، ان سے ان سے ملیے تو اس طرح، ان سے بات کیجیے تو ایسے —— اور ذاکر صاحب کا محترمہ آصفہ مجیب کے الفاظ میں

"ذاکر صاحب جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے
ہمیشہ اس سے بے پروا رہے ہر قاعدہ کی پابندی
سے آزاد، نہ کھانے کا وقت ٹھیک نہ سونے کا۔ کام
میں لگے تو گھنٹوں لگے رہے۔ دن کو دن سمجھے
نہ رات کو رات، ایک طرف مصروفیت میں تمام دن

کھانے کا خیال نہ آتا تو دوسری طرف مروت میں
ایک وقت میں دو جگہ دعوت قبول کر لیتے اور،
دوسروں کی خوشی پوری ہو جاتی ۔ ضرورت پڑتی
تو جون کی چلچلاتی دھوپ میں تانگہ پہ چلے جاتے "

لیکن اپنے آپ سے بے پروائی کے باوجود نائب صدر جمہوریہ کا عہدہ جلیلہ کے لئے جن پر مراسم و آداب کی پابندی لازمی تھی اس میں سر مو فرق نہ آنے پایا ایسی کتنی ہی باتیں ہیں جو بے شمار تاروں کی طرح ایک جھرمٹ میں ان کی فطرت کے بنیاد کی ترجمانی کرتی ہیں ۔ ان کی زندگی ایک دریا کی طرح لہریں مارتی نظر آتی ہے جس میں نرمی، روانی، تڑپ سبھی کچھ ہے ۔

" کبھی صبر و ضبط اور استقلال کا ٹھہراو ۔ کبھی طوفان کے تھپیڑے، کبھی مسکراہٹیں اور زندہ دلی اور راحتیں، اور برکتیں ۔ "

نجی زندگی ۔

اس مرحلہ پر جب کہ ذاکر صاحب کو سب سے بڑے عہدہ صدارت پر پہونچنے میں ایک ہی منزل کی کسر رہ گئی ہے ۔ ان کی نجی اور گھریلو زندگی کی ایک جھلک دیکھ لینا بھی ضروری ہے اس سلسلہ میں ان کے قریبی دوستوں پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین اور رشید احمد صدیقی کے علاوہ اردو کی مشہور ادیبہ محترمہ سلمیٰ صدیقی اور خود ذاکر صاحب کی صاحبزادی محترمہ سعیدہ خورشید عالم کے چند مختصر مضامین کے علاوہ بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے ۔ محترمہ سعیدہ خورشید عالم اپنے والد بزرگوار کو "میاں" کے لقب سے یاد کرتی تھیں وہ لکھتی ہیں ۔

" میاں کو بچوں سے بڑی دلچسپی ہے ۔ میرے

اور میری بہن کے بچوں سے بہت لگاؤ ہے، ان کی شرارتوں اور شوروغل سے کبھی تنگ نہیں آتے اور اپنی انتہائی مصروف زندگی میں بھی بچوں کی معمولی معمولی خواہشوں کو پورا کرنے کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں کھانے کی میز پر بیٹھ کر میاں سے ہم ہر قسم کی گفتگو اطمینان سے کر سکتے ہیں۔ وہ، کھانا بھی کھاتے ہیں اور لطیفے بھی سناتے ہیں، ان کے لئے کوئی مخصوص چیز پکی ہو یا پرہیزی کھانا ہو تو وہ اپنے ہاتھ سے سب کو تقسیم کر دیتے ہیں اور خود وہی کھانا جو سب کے لئے پکا ہو کھاتے ہیں۔ آموں کے زمانے میں آم، تراش تراش کر سب کو کھلائیں گے ——— آم انھیں بہت مرغوب ہیں، آپ کی قسموں، ان کے بونے اور توڑنے کے طریقوں۔ باغ کی نگہداشت پر جس وقت گفتگو شروع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھر یہی کام کیا ہے۔ آم کھاتے ہوئے یہ شعر اکثر پڑھتے ہیں

انگبیں کہ بہ حکم رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس "

ایک شفیق باپ اور ایک مہرباں سرپرست خاندان کا یہ روپ کتنا دلنواز ہے دوسری طرف یہ بھی کہ ———

"میاں حسن کے شیدائی ہیں۔ پھول، پتھر، آرٹ زندگی ہر چیز میں اسی کے متلاشی رہتے ہیں۔

بدنمائی اور بگاڑ کو دل ان کے دل نے کبھی قبول نہیں
کیا۔ پتھر جمع کرنا ان کی ہابی ہے ایک مرتبہ،
کہنے لگے مجھے پھول بیحد پسند ہیں لیکن پتھر ان سے
بھی زیادہ۔ اس لئے کہ پتھر مایوس نہیں کرتے اور
اگر ضرورت پڑ جائے تو مارنے کے کام بھی آجاتے ہیں"

لباس کے بارے میں نفاست پسندی کا یہ عالم ہے کہ
"انتہائی پریشانی عسرت اور فلاکت کے دور میں بھی دودھ کی طرح سفید کھادی پہنتے۔ اچکن پر کبھی جھول نہ پڑنے دیتے ۔" کھانے پینے میں بھی محترمہ سعیدہ خورشید عالم کے بیان کے مطابق وہ برے سے برا کھانا چپ چاپ کھا لیتے ہیں۔ لیکن چاہتے ہیں کہ کھانا اچھے سے اچھا پکایا جائے۔ اچھا کھانا کھا کر اتنی فرحت محسوس نہیں کرتے جتنی دوسروں کو کھلا کر محسوس کرتے ہیں۔ اٹاوہ میں طالب علمی کے زمانے میں جب اسکول کے مینیجر جناب بشیر الدین صاحب نے ذاکر صاحب اور ان کے کچھ ساتھیوں کو کھانے میں ایک ایک گلاس پانی ملا کر دیا تو سب ساتھی ایک ایک لقمہ لیکر اٹھ گئے لیکن ذاکر صاحب نے پورے اطمینان سے کھانا کھایا، اور اس طرح اٹھے جیسے بہت لذیذ کھانا کھایا ہو ۔"

ادھر محترمہ سعیدہ کی سہیلی سلمٰی صدیقی کے یادوں کے جھروکے سے' ذاکر صاحب کا مشفقانہ چہرہ ایک اور انداز میں ابھر آتا ہے۔

"ذاکر صاحب کو عمدہ اور لذیذ کھانوں کا بہت شوق
تھا۔ جلّے کے جاڑوں میں ان کے گھر پر صبح کے
ناشتے میں کھچڑی اور عمدہ گھی کھانے کا ایک زمانہ
میں دستور تھا۔ اور کھچڑی چچی (بیگم ذاکر حسین
اپنی خاص نگرانی میں پکواتی تھیں ۔ اور وہ بڑے

اہتمام سے کھائی جاتی تھی ۔ اس کھچڑی کا مزہ
اب تک یاد ہے ۔ علالت کی بنا پر جب
ڈاکٹروں نے ان کے لیے پرہیزی غذائیں تجویز
کیں تو وہ مجبوراً ان پر قناعت کرنے لگے ۔ لیکن
جب بھی گھر والوں کی پلک جھپکتی وہ بدپرہیزی
پر آمادہ ہو جاتے ۔ ایک دن جب علالت
کچھ بڑھ گئی تھی اور اس کے نتیجہ میں پرہیز بھی
سخت کرنا پڑ رہا تھا ، سعیدہ نے مزاج پرسی
کی تو بڑے ہی مایوسی کے لہجہ میں بولے ۔۔۔۔
ارے بھئی طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن پیٹ کی مار
برداشت نہیں ہوتی ۔

ڈاکٹر عابد حسین ذاکر صاحب سے اپنے ۴۴ سالہ روابط و تعلقات تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"میں نے اس پورے عرصہ میں انھیں ہمیشہ افراد اور
جماعتوں کی بھلائی کی کوشش میں محو دیکھا ۔
لیکن میرے علم و یقین میں نہ انھیں کبھی خدمت
کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا ، اور نہ اپنے آپ کو وقف
کرنے کا ۔ نہ تیاگ کا ۔ نہ ایثار و قربانی کا ۔۔۔
احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود
بے تکلف ، بے رکاوٹ ، ایک سمت بہہ رہا ہے
اور انہوں نے کہا اچھا ہے بہنے دو ، سماجی اور
انسانی دوست ٹائپ کی ایک اور پہچان ہے

اور وہ بھی ذاکر صاحب میں بدرجہ اتم موجود ہے
ان میں خودی ، اور بے خودی اس طرح گھل مل
کر شیر و شکر ہو گئی ہے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ
میں خواہ کسی ملک کسی مذہب کسی طبقے کے ہوں انہیں
احساس کمتری اور اظہارِ برتری کی کش مکش سے گذرنا
خود فروشی ، خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں
پڑتا۔ وہ انسان کو سہولت سمجھ کر اس کی تنقید تحلیل
اور تجزیہ نہیں کرتے بلکہ جیسا ہے ، اسے
سارے کا سارا قبول کر لیتے ہیں۔ گاندھی جی نے
کہا تھا کہ اس انسان کو جس کے اندر برائی نظر آئے
بیمار کی طرح ہمدردی کے قابل اور علاج کا محتاج
اور علاج کا سزاوار سمجھو۔ اور اس اصول پر اپنی
طبیعت کے تقاضہ سے عمل کرتے ہوئے میں
نے کسی کو دیکھا ہے تو ذاکر صاحب کو۔ "

ذاکر صاحب کی جلوت اور خلوت میں یہی رنگ سب سے زیادہ غالب رہا۔ بچوں میں ہیں تو بچوں کی سطح کی باتیں کر رہے ہیں۔ آم کھا رہے بدپرہیزی کے مرتکب ہو رہے ہیں کسی کو نصیحت کرنی ہو تو انداز ایسا کہ نصیحت بھی کہانی بن جائے کسی کو کسی بری عادت پر ٹوکنا ہو تو طریقہ ایسا کہ عمر بھر اس اقدام سے احتراز کرے جسے ذاکر صاحب برا سمجھتے ہوں، ان کے ایک ملازم کو صبح دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔ کوئی لاکھ کہے وہ اس وقت تک بیدار نہ ہوتا۔ جب تک کہ سورج پوری آب و تاب سے طلوع نہ ہو جاتا۔ ذاکر صاحب چپ چاپ اس کی عادت کا مشاہدہ کرتے رہے اور ایک دن سویرے ہی اس کے بستر پر پہونچ گئے۔ ایک ہاتھ میں پانی بھرا آفتابہ اور دوسرے میں منجی

کی شبیشی ــــ بڑے پیار سے جگایا۔ بولے منھ دھو لو، چاء تیار ہے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن ــ چارو ناچار، منھ دھویا تو ذاکر صاحب چائے کی پیالی لیے کھڑے ہیں۔ اس افتاد نے اس بیچارہ کو اتنا شرمسار کیا کہ وہ کڑاکے کے جاڑوں میں بھی گھبرا کر دم اٹھ بیٹھا۔

ذاکر صاحب کی نجی زندگی کے ان پراگندہ اوراق کو جوڑیئے تو ایک خوبصورت دیوان مرتب ہو جائے گا۔ ان کے ایک مخلص دوست رشید احمد صدیقی ہیں ــ ذرا ان کی زبان سے ذاکر صاحب کے شوق اور ان کے خیالات، اور رجحانات کا حال سنتے چلیے تاکہ آپ باور کر سکیں کہ ذاکر صاحب کی قلندرانہ روش میں بھی کتنا بانکپن تھا اور اس بانکپن کے اجزائے ترکیبی کن کن عناصر پر مشتمل ہیں۔

"ذاکر صاحب ہندستانی پکے گانے، اور مصوری کے جدید اسالیب اور رجحانات کے بڑے قدرداں ہیں۔ ہندستانی موسیقی کے علاوہ یورپین موسیقی کے بھی دلدادہ ہیں ہم میں کم لوگوں کے پاس ہندستانی اور یورپین موسیقی کے ماہرین کے منتخب گراما فون ریکارڈ موجود ہونگے جتنے ذاکر صاحب کے پاس ہیں علم و فن کے باکمالوں کو علی گڈھ میں جمع کرنے کی ذاکر صاحب کو بڑی فکر رہتی تھی ـ اکثر کہا کرتے کاش ایسا ہو سکتا کہ ہندستانی ساز اور موسیقی کے منتخب روزگار علی گڈھ میں اکٹھا کئے جا سکتے ـ باکمالوں کی جگہ نوجوانوں میں ہے ــــ"

خواجہ غلام السیدین نے بھی ذاکر صاحب کو کئی مرحلوں پر آزمایا ہے اور وہ انھیں

اقبال کا مرد مومن کہتے ہیں۔

ع مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں آفاق ہے

اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "ذاکر صاحب کے فقر میں بھی یہ انوکھی شان ہے کہ اگر خانہ کعبہ کا دروازہ نہ کھلے تو وہ الٹے واپس آجاتے ہیں۔ اور اسی کا فیضان ہے کہ ارباب دولت اور مشاہیر سیاست ان سے جھک کر ملتے ہیں۔ انھیں مرعوب نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال تھا کہ دولت کی سعادت اور نجات یہ ہے کہ وہ علم کی خدمت کرے اور نیک کاموں کے قدم چومے۔

استاد سے صدارت جمہوریہ ہند کی منصب جلیلہ تک بیگم بازار حیدرآباد کے مختصر سے آبائی مکان سے لیکر راشٹرپتی بھون تک ان کی سیرت اور کردار کی استقامت کے کتنے ہی جلوے دیکھے جاسکتے ہیں۔ پروفیسر مجیب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

"کسی تاریخی شخصیت کے عمل کو سمجھنے کے لئے سب سے مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کی جگہ پر تصور کریں، اور ان تمام حالات اور تمام لوگوں کو نظر میں رکھ کر سوچیں کہ ہم ہوتے تو کیا کرتے اپنے آپ کو اس مسند پر تصور کیجئے جس پر ذاکر صاحب صبح سے شام تک بیٹھے رہتے تھے

کیسا یہ بات آپ سے ممکن ہے کہ آپ اپنے اس نوکر کو جو گراں خوابی کا عادی ہے اس طرح مجبوب کریں کہ خود صبح سویرے جائے لیکر اس کے سرہانے بیٹھ جائیں اور اسے یہ کہہ کر جگائیں کہ بھائی سورج سر پہ آگیا ہے۔۔۔۔ استاد جامعہ سے نائب صدارت اور پھر صدارت جمہوریہ تک ذاکر صاحب کو کن مراحل سے گذرنا پڑا ہوگا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کا تصور کیجئے اور پھر ان کی اس دروں خانہ تصویر پہ نظر ڈالئے جو

ان کی صاحبزادی نے بڑے پیار سے بتائی ہے۔ راجیہ سبھا کے شور و ہنگامے سے فرصت پاکر بال بچوں میں بیٹھے ہیں تو ایسے کہ جھنجھلاہٹ کا دور دور تک پتہ نہیں۔ آم کی خاشیں کاٹ کاٹ کر تقسیم کی جارہی ہیں اور پھر لطیفے بھی سنائے جارہے ہیں۔ تدریس و تعلیم کے لیے ہمیشہ کی روایتی خشکی سے کون واقف نہیں لیکن بیٹھک میں اپنے عصر کے بہترین مصوروں کے شاہکار آویزاں کلاسکی موسیقی کے ریکارڈ سن رہے ہیں۔ اور ان پہ سر بھی دھن رہے ہیں۔

ذاکر صاحب کی نجی زندگی کا یہ پہلو بہت جاذب نظر ہے۔ ان میں روایتی معلم کی تنگ مزاجی ملے گی، نہ پیشہ ور سیاست دان کا کٹرپن۔ سیدھے سادھے سے آدمی نہ علم و دانش کا غرور، نہ بڑے پن کا اظہار شوق، بے تکلفی سے کہیں بھی بیٹھ جائیں۔ ہر ایک سے کھل کر بات کریں۔ نائب صدارت اور صدارت کے دور میں بھی جو لوگ ان سے ملتے انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ ایک دوست سے ملے ہیں۔ دنیا کے اکثر بڑے آدمیوں کی زندگی میں بڑی چمک دمک اور بڑا ہی گلیمر رہا ہے۔ ان کے کامیاب ۔۔۔ اور ناکام عشق کی داستانیں بھی جلال و جبروت کے پس منظر میں تحریر کی جاتی ہیں، ان کی ایک ایک بات کا تذکرہ کس شان سے چلتے تھے۔ کس فخر و افتخار سے شاہانہ باغ میں گلگشت کرتے۔ ایک وقت تو کتنے بجے بیدار ہوتے۔ فروعی امور و مسائل کی یہ ساری تفصیلات کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر خوف اور ہیبت طاری ہوجائے۔ لیکن ذاکر صاحب تو ایک ایسے بڑے آدمی تھے جنھوں نے زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی اپنی شخصیت کے گرد کوئی ایسا ہالہ بننے نہیں دیا جو، ان کی ذات کا احاطہ کرے اور اسے بے حد پراثر بنادے

نائب صدارت کا دور

نائب صدر جمہوریہ کی حیثیت سے ذاکر صاحب نے متعدد بیرونی ممالک کے دورے بھی کیے۔ ۱۹۶۴ء میں وہ الجیریا، تیونس اور مراقش ہو آئے اور اسی سال کویت

سعودی عرب ، اردن، ترکی اور یونان کی سیاحت بھی کرلی۔ ان دنوں قبرص کے مسئلہ پر ہندستان اور ترکی کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ ہندستان اور پاکستان کے اختلافات کے تعلق سے ترکی کا نقطۂ نظر حکومت ہند کے لئے قابل اعتراض بن گیا تھا۔ لیکن وزارت خارجہ کی ۶۶-۱۹۶۵ء کی رپورٹ کے مطابق ذاکر صاحب کے دورۂ ترکی کے نتیجہ میں بہت سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگیا۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۶۶ء میں بھی ذاکر صاحب بیرون ممالک کے دورہ پر نکل پڑے اور ان کا یہ دورہ بھی بحیثیت مجموعی بہت مفید ثابت ہوا۔ جولائی ۱۹۶۶ء میں انہوں نے افغانستان کا سرکاری دورہ کیا، اور اسی دورہ میں انھیں اپنے دوست ، اور ہندستان کی جنگ آزادی کے رہنما خان عبدالغفار خاں سے ملاقات کا موقعہ مل گیا جنھوں نے پاکستان چھوڑ کر کابل میں سکونت اختیار کرلی تھی اسی سال اکتوبر میں ذاکر صاحب نے تھائی لینڈ، کمبوڈیا، سنگاپور اور ملایا کا دورہ کیا جرمنی میں کئی برس کے قیام اور مغربی مفکرین اور دانشوروں کی صحبت نے ذاکر صاحب کے انداز فکر کو پہلے ہی سے نکھار دیا تھا۔ اور عصر حاضر کے مثبت اور منفی دونوں ہی پہلو ان کے پیش نظر تھے۔ بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں، نوآبادیاتی نظام کو ایک نئی شکل دیکر ترقی پذیر ممالک کے استحصال کی مذموم کوشش ، ہتھیاروں کی ریس، خدا کی بستی کو دوکان بنانے کے منصوبے ذاکر صاحب ان کے محرکات اور مضمرات سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ ۶ نومبر ۱۹۶۶ء کو جب دہلی کے سپرو ہاؤس میں " نیوکلیر ہتھیار اور خارجی حکمت " کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کو مخاطب کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے تو انہوں نے ایسی باتیں کہیں جو ساری دنیا کا موضوع بحث بن گئیں ۔ انہوں نے کہا۔

"۱۹۵۷ء ہی میں مسٹر نہرو نے ٹرامبے کے جوہری توانائی
کے مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے صاف الفاظ میں اس
امر کا یقین دیا تھا کہ ہندستان صرف پرامن اغراض کی
تکمیل کے لئے جوہری توانائی سے استفادہ کرے گا۔

حکومت ہند مسٹر نہرو کی اس معلنہ پالیسی پر سختی سے کاربند ہے، حالانکہ اس پر مختلف گوشوں سے دباؤ پڑ رہا ہے کہ وہ نیوکلیر توانائی کے تعلق سے اپنا رویہ بدلے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چین کی طرف سے ہم پر نیوکلیر حملہ کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر ہم ان ساری باتوں کے باوجود بھی آگ سے کھیلنے کے کسی مشورہ کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارا احساس یہ ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری سے ہمارے احتراز نے بعض اور ممالک کو نیوکلیر ہتھیاروں کی اس تیاری سے ہمارے احتراز نے بعض اور ممالک کو نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری کی رسیا سے دور رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن یہ ہمارا قومی فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ ملک کے معاشی سماجی اور فوجی حالات کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ اسے ہمارے اس ایقان سے خلط ملط نہیں کیا جاسکتا کہ ساری دنیا کے ممالک کو خواہ وہ چھوٹے ہوں کہ بڑے نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری سے احتراز کے کسی معاہدہ کا فریق بننا چاہیئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا ہم سے کوئی ایسا تیقن حاصل نہیں کیا جاسکتا کہ ہم کسی صورت میں بھی نیوکلیر ہتھیار تیار نہ کریں

کریں گے۔ جس دن ہماری آزادی اور سالمیت
کو نیوکلیر ہتھیاروں سے فی الواقعی خطرہ لاحق ہو جائیگا
اس دن ہمیں اپنے دماغ کو کہنے نیوکلیر ہتھیار تیار کرنے پڑینگے

حکومت ہند کی معلنہ پالیسی کے بارے میں نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہ ریمارکس اگرچہ قابل اعتراض نہیں تھے لیکن بعض سیاسی گوشوں سے ان کی اس تقریر کو حکومت کی پالیسی کے منافی اور منافی قرار دینے کی کوشش کی گئی لیکن ذاکر صاحب ان تنقیدوں پر دھیان دیئے بغیر اظہار خیال کی آزادی سے اُس وقت بھی استفادہ کرتے رہے جب کہ ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ نائب صدر ہونے کے ناطہ وہ حکومت کی ہر پالیسی کی بلاچوں وچرا تائید کریں گے سچ تو یہ ہے کہ نائب صدارت کے اس دور میں ذاکر صاحب نے اپنی ذاتی اور شخصی رائے پر' سرکاری رائے کو غالب نہیں ہونے دیا اور اس اعتبار سے انہوں نے اس عہدہ کے وقار و مرتبہ میں اضافہ کیا۔ چنانچہ ان کی نائب صدارت کے آخری مراحل میں ارباب فکر ونظر محسوس کرنے لگے تھے کہ وہی اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے جانشین بن سکتے ہیں صدر جمہوریہ کی میعاد کے اختتام سے کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر رادھا کرشنن نے یوم جمہوریہ کے موقع پر قوم و ملک کے نام جو پیام نشر کیا تھا باخبر اور واقف کار سیاسی حلقوں نے محسوس کرلیا کہ یہ ان کی وداعی تقریر ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں سیاسی گٹھ بندیوں، اور اجتماعی زندگی پر ذات پات کے منحوس سایہ کی مذمت کی۔ قانون ساز اداروں کے عوامی منتخبہ نمائندوں کی بے قاعدگیوں پر طنز کیا اور یہ بھی کہا کہ ہم اس طرح انقلاب کو پیچھے کی طرف ڈھکیل رہے ہیں۔ صدر جمہوریہ نے کسی مصلحت اندیشی سے کام لئے بغیر بتایا کہ بد دیانتی اور بے ایمانی ہماری اجتماعی زندگی کا جزو لازم بن گئی ہے۔ مرکز اور ریاستوں میں سرکاری عہدوں پر فائیز عہدہ داروں پر رشوت ستانی کے الزامات لگائے جارہے ہیں۔ وزیروں پر شک و شبہ کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ان الزامات کی چھان بین کرائی جانی چاہیئے۔ تاکہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے

ملک کے سیاسی قائدین کو مشورہ دیا کہ وہ ملک کے مستقبل کا ایک واضح خاکہ پیش نظر رکھیں اور صرف اپنے اقتدار اور اپنی آسائیشوں کی بقاء ہی کو نصب العین نہ بنائیں اپنی اس تقریر کے آخر میں انھوں نے کہا کہ

"مجھے صدر راجندر پرشاد، مسٹر نہرو، مسٹر لال بہادر شاستری اور شریمتی اندرا گاندھی، سبھوں کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا، میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان سب کا اعتماد حاصل رہا۔ اور دیگر پارٹیوں کے قائدین نے بھی مجھ پر پورا بھروسہ کیا۔ میں جتنی محبت اور عزت کا مستحق نہیں تھا، میرے عوام نے مجھے اتنی ہی محبت اور عزت عطا کی۔ میری تمنا ہے کہ میرا ملک ہمیشہ چوکس وہوشیار رہے اور نئے خیالات کو قبول کرنے میں اسے کوئی تامل نہ ہو۔"

اس تقریر کے لب ولہجہ ہی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا تھا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن صدارت کے عہدہ کے لئے دوسری مرتبہ چناؤ لڑنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ ان کی اس تقریر کے بعد ہی ان کے موزوں جانشین کے بارے میں پیش قیاسیاں کی جانے لگیں اور مختلف گوشوں سے بیک آواز ذاکر صاحب کا نام لیا جانے لگا۔ ان کی جانب سے یہ استدلال پیش کیا کہ ماضی میں جب نائب صدر کو کارآموز صدر سمجھا جاتا رہا ہے اور صدر کی میعاد کے اختتام پر نائب صدر ہی کا انتخاب عمل میں لایا جاتا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ذاکر صاحب کو اس روایت سے مستثنیٰ کیا جائے۔ ہندی بولنے والی ریاستوں کی سیدھے بازو کی سیاسی جماعتیں بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ذاکر صاحب جمہوریہ ہند کے صدر بنیں۔ ان کے اس رجحان کا محرک فرقہ وارانہ جذبہ تھا کچھ لوگ

ذاکر صاحب کی گرتی ہوئی صحت کا حوالہ دیکر کہنے لگے تھے کہ وہ صدارت کی گراں بار ذمہ داریوں کے متحمل نہ ہو سکیں گے۔ لیکن ملک کے صائب الرائے حلقوں کا خیال تھا کہ اس موقع پہ ذاکر صاحب کو صدارت سے محروم کرنا سیکولرازم کے لئے بیحد مضرت رساں ثابت ہوگا جسے ہندستان اپنے نصب العین کی حیثیت سے قبول کر چکا ہے۔

اسی اثناء میں ذاکر صاحب نے بھی نائب صدارت سے دستبردار ہوجانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے اپنے قریبی رفیقوں کو بتایا کہ ان کی نائب صدارت کے ۲½ سال تو بڑے خوشگوار رہے لیکن بعد کے ۱۸ ماہ کا عرصہ ان کے لئے بیحد صبر آزما ثابت ہوا۔ راجیہ سبھا کے ہنگاموں نے انھیں بہت بیزار کر دیا تھا، اور اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پہ وہ صدر نشین راجیہ سبھا کی ذمہ داریوں کی تکمیل کئے جا رہے تھے۔ ایک طرف تو ان کے اندر کا شریف آدمی عوام کے منتخبہ نمائیندوں کی جانب سے غم و غصہ کے بے محابا مظاہروں پہ مغموم ہوتا تو دوسری طرف، ان کی شخصیت کا جزو بن جانے والا مدرس اور استاد ان پڑھے لکھے اور شائستہ لوگوں کی بے قاعدگیوں پہ انھیں مایوس کر دیتا۔ راجیہ سبھا میں ایسے پارلیمنٹیرین بھی تھے جن کی صلاحیتوں نے ذاکر صاحب پہ بڑا گہرا نقش چھوڑا۔ خاص طور پہ مسٹر بھوپیش گپتا اور مسٹر اٹل بہاری واجپائی کی وہ بہت تعریف کرتے تھے لیکن کچھ ایسے کرم فرما بھی تھے جو ایوان کو اچھا خاصہ اکھاڑا بنا دیتے اور اسی کو اپنا سب سے بڑا کمال تصور کرتے۔ اس صورت حال نے ذاکر صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ نائب صدارت کے عہدہ سے دستبردار ہو جائیں اس فیصلہ پہ وہ اتنے اٹل تھے کہ انہوں نے اپنی سرکاری قیامگاہ سے اپنا سامان جامعہ نگر میں موقوعہ اپنے ذاتی مکان کو منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۶۷ء میں یہ سوال ہر حلقہ میں پوچھا جانے لگا کہ کیا ذاکر صاحب سچ مچ نائب صدارت کے عہدہ سے دستبردار ہو جائیں گے! اور کیا انھیں صدارتی امیدوار نامزد کیا جائے گا!

صدارتی انتخاب

ذاکر صاحب نے جس صدارتی چناؤ میں حصہ لیا تھا، اس سے پہلے کے تمام صدارتی انتخابات میں کانگریسی امیدوار ہی کا انتخاب عمل میں آتا رہا لیکن جس صدارتی چناؤ میں ذاکر صاحب کو امیدوار نامزد کیا گیا اس میں پہلی مرتبہ اپوزیشن جماعتوں کے متفقہ امیدوار نے ذاکر صاحب کے ایک طاقتور حریف کی حیثیت اختیار کر لی نتیجتاً یہ چناؤ بھول کا مرکز توجہ بن گیا۔ خود کانگریسی قیادت بھی ذاکر صاحب کی نامزدگی کے تعلق سے متفق الخیال نہ تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت کے صدر کانگریس مسٹر کامراج باور کرتے تھے کہ ذاکر صاحب کی کامیابی کے امکانات موہوم ہیں، وہ چاہتے تھے کہ اگلی میقات کے لئے بھی ڈاکٹر رادھا کرشنن ہی کو کانگریس کا امیدوار نامزد کیا جائے۔

اس کے برعکس شریمتی اندرا گاندھی کو ذاکر صاحب کی کامیابی کا یقین کامل تھا اور وہ ان کی نامزدگی کی زبردست حامی تھیں۔ کچھ ایسے آثار بھی پیدا ہو چلے تھے کہ جس کی بناء پر یہ سمجھا جا رہا تھا کہ شاید ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنی رائے بدل دیں، اور دوسری میقات کے لئے بھی صدارتی امیدوار بننا قبول کر لیں۔ اس غیر یقینی صورت حال میں صرف یہ بات امید افزا تھی کہ اپوزیشن کے لئے بھی ذاکر صاحب کی شخصیت ہی جاذب نظر تھی اس کے باوجود وہ کانگریس کے داخلی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر صدارتی چناؤ میں اس کے امیدوار کو شکست دینا چاہتے تھے۔ اسی اثناء میں صدر جمہوریہ ہند کے فرائض و اختیارات کے بارے میں بحث شروع ہو گئی۔ اور اس سلسلہ میں بعض ایسے بیانات بھی جاری کئے گئے جن کا تعلق ذاکر صاحب کی ذات اور شخصیت سے تھا ان بیانات سے ذاکر صاحب کو بہت دکھ پہونچا، کیونکہ انھیں یہ بات پسند نہ تھی کہ اس بحث میں ان کی شخصیت کو الجھایا جائے۔ ملک کے معمر اور بزرگ سیاست داں مسٹر راجگوپال چاری نے ۲۵ رفبروری ۱۹۶۷ء کے سوراجیہ میں ذاکر صاحب کی صدارتی امیدوار کی حیثیت سے

نامزدگی کی تائید کی۔ سروودیہ لیڈر مسٹر جے پرکاش نارائن نے بھی ذاکر صاحب کی نامزدگی کی بھرپور تائید کی، لیکن راج گوپال چاری کا نقطہ نظر اس اثنا میں قدرے بدل گیا اور انہوں نے اس بات کا اعادہ کرتے ہوئے کہ وہ ذاکر صاحب کی امیدواری کے حامی ہیں لیکن اگر کسی وجہ سے ذاکر صاحب کی کامیابی کے امکانات موہوم ہیں تو ان کا خیال ہے کہ مسٹر جے پرکاش نارائن کو امیدوار نامزد کیا جانا چاہیئے ۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۷ء کو ایک مشترکہ بیان کے ذریعہ مسٹر ایم آر مسانی، مسٹر ایس یم جوشی اور مسٹر ناتھ پائی نے بھی مسٹر جے پرکاش نارائن کے امیدوار بنائے جانے کی تجویز کی حمایت کی لیکن مسٹر جے پرکاش نارائن نے صاف اور مبہم الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ صدارتی امیدوار بننے پر تیار نہیں ہیں ۔ بالآخر ۴ اپریل ۱۹۶۷ء کو پارلیمنٹ میں اپوزیشن پارٹیوں کے لیڈروں نے مسٹر کے سباراؤ (سابق چیف جسٹس آف انڈیا) کو متفقہ طور پر اپنا امیدوار نامزد کرنے کا فیصلہ کیا ۔ ۷ اپریل کو مسٹر کے سباراؤ نے اپوزیشن پارٹیوں سے ملاقات کی اور اپنے فیصلہ کے لئے دو دن کی مہلت چاہی۔

دوسرے ہی دن صدارتی امیدوار کے تعلق سے قومی سطح پر اتفاق رائے کے حصول کے لئے شریمتی اندرا گاندھی نے ایک مشاورتی اجلاس طلب کیا۔ لیکن اس میں شرکت سے اپوزیشن لیڈروں نے انکار کر دیا۔ اس اثنا میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ ذاکر صاحب کو بالاتفاق آرا صدر اور مسٹر کے سباراؤ کو نائب صدر چنا جائے ۔

۹ اپریل کو ڈاکٹر رادھا کرشنن نے بھی ایک بیان جاری کیا۔ جس میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ وہ دوسری میقات کے لئے صدر بننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بعض قائدین کا اصرار ہے کہ وہ دوسری میقات کے لئے صدارتی ذمہ داریاں قبول کریں لیکن وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی نہیں کریں گے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو مسٹر کے سباراؤ نے چیف جسٹس آف انڈیا کے عہدہ سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ اور اپوزیشن نے اپنے امیدوار کی حیثیت سے ان کی نامزدگی کا

باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اسی دن یعنی ۱۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو کانگریس پارلیمانی بورڈ نے بھی صدارتی چناؤ میں ذاکر صاحب کو کانگریسی امیدوار نامزد کیا، اور مسٹر گیری جو ان دنوں میسور کے گورنر تھے، نائب صدارت کے امیدوار نامزد کئے گئے۔

اب صدارتی چناؤ کا معرکہ شروع ہو گیا۔ اس اثناء میں مسٹر جے پرکاش نارائن نے ایک طویل بیان جاری کیا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ملک کے سب سے بڑے اور ذمہ دارانہ عہدہ کے لئے موزوں ترین شخصیت کا انتخاب عمل میں لایا جانا چاہیے اور ہر ایسا شخص جسے ہندستان کی جنگ آزادی سے ذرا بھی تعلق رہا ہے وہ اس عہدہ کے لئے ذاکر صاحب پر کسی اور شخصیت کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک برسرِ عہدہ چیف جسٹس کو صدارتی امیدوار بنا کر اس کی انتخابی مہم چلانے سے ایک غلط مثال قائم ہو جائے گی اور اس سے جمہوریت کو نقصان پہنچے گا۔ چیف جسٹس کا جو عوام کی نظر میں ایک بالکلیہ غیر جانبدار شخصیت ہوتی ہے، اپوزیشن جماعتوں سے وابستہ ہو جانا بڑی پیچیدگیاں پیدا کر سکتا ہے۔ انھوں نے ذاکر صاحب کو صدارتی امیدوار نامزد کرنے پر کانگریس پارلیمانی بورڈ کو مبارکباد دی، اور اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ صدارت کے لئے ذاکر صاحب جیسے موزوں امیدوار کو بھی بلاوجہ مقابلہ میں الجھایا جا رہا ہے۔

انتخابی مہم کے دوران یہ بحث بھی چھیڑ دی گئی کہ صدر جمہوریہ ہند کے فرائض و اختیارات کے بارے میں کانگریس اور اس کے امیدوار کے تصوّرات دستور کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہیں، اس کے نتیجہ میں انتخابی مہم، اصولوں اور نقاط نظر میں ٹکراؤ کی شکل اختیار کر لی۔ بعض گوشوں سے اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ دستور کے تحت صدر جمہوریہ ہند کا عہدہ محض ایک نمائشی اور مشاورتی ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارے دستور کے ترتیب کار مسٹر امبیڈکر اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ صدر جمہوریہ ہند وزیر اعظم کے تقرر اور پارلیمنٹ کی تحلیل کے مسئلہ میں اپنے اختیارِ تمیزی سے کام لے سکتے ہیں، اور

خاص حالات میں انھیں حکومت کی برطرفی کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے، چنانچہ صدر جمہوریہ کے اختیارات و فرائض پر اس بحث کے دوران، ہمارے ملک کے ایک مشہور ماہر قانون اور ایڈوکیٹ جنرل مہاراشٹرا مسٹر ایچ ایم سیروائی نے بھی اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی کہ دستور کے تحت صدر جمہوریہ ہند کا عہدہ محض نمائشی ہوتا ہے۔

چناؤ مہم کے شباب پہ ڈاکٹر ذاکر حسین ۲۶ اپریل کو امریکہ روانہ ہو گئے تاکہ مشیگن یونیورسٹی کی ۱۵۰ ویں سالگرہ کی تقاریب میں شرکت کر سکیں۔ صدارتی چناؤ کی تاریخ ۶ مئی ۱۹۶۷ء سے تین دن قبل وہ دہلی واپس ہوئے۔

چناؤ کے دن پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں پولنگ کے آغاز کے چند منٹ بعد ہی ذاکر صاحب نے انگریزی ہفتہ وار لینک (Link) کے نمائندہ خصوصی نے پوچھا تھا کہ ان کے تاثرات اور احساسات کیا ہیں اور ذاکر صاحب نے صاف الفاظ میں کہا تھا انتخابی مہم کے دوران، ان کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے کہ وہ اس سے بیحد مغموم اور رنجیدہ ہیں۔

ذاکر صاحب بہت بڑی اکثریت سے صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے سیاسی حلقوں نے ان کی اس شاندار کامیابی کو وزیر اعظم اندرا گاندھی کی حکمت عملی کی کامیابی کے مترادف قرار دیا۔ ذاکر صاحب نے اولین ترجیح کے ۴ لاکھ ۷۱ ہزار ۲۴۴، اور ان کے حریف مسٹر سبا راؤ نے ۳ لاکھ ۶۳ ہزار ۹۷۱ ووٹ حاصل کئے۔

ان کی اس کامیابی پر سارے ملک میں مسرت کا اظہار کیا گیا اور خاص طور پر ان عناصر کو بڑی طمانیت ہوئی جو ذاکر صاحب کے چناؤ کو سیکیولرازم کی کسوٹی قرار دے رہے تھے۔ اپنے انتخاب کے فوراً بعد ذاکر صاحب نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک پیام نشر کیا جس میں انہوں نے کہا

"یہ ایک بڑا اعزاز ہے کہ میرے ہموطنوں نے
مجھ جیسے ایک حقیر اور کم مایہ شخص کو جس نے اپنی

زندگی کے ۴۷ برس درس و تدریس کے بے چمک دمک پیشہ میں گذار دیئے ہیں ملک کے سب سے بڑے عہدہ کے لئے منتخب کیا ہے میرے نزدیک ایک استاد کا ایک عہدہ جلیلہ پر انتخاب اس بات کی دلیل ہے کہ میرے ملک کے لوگ تعلیم کی اہمیت، اور استاد کی تکریم و تحریم کے نظریات و روایات پر اب تک بھی کاربند ہیں۔ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے ملک کے عوام نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل اور مستحق ثابت کرنے کی بھرپور اور بساط بھر کوشش کروں گا۔ میں نے مہاتما گاندھی کی شخصیت اور ان کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اجتماعی زندگی میں قدم رکھا تھا، اور میں ان کی تعلیمات پر عمل بھی کرتا رہا ہوں۔ اب جب کہ مجھے صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے عوام کی خدمت گذاری کا ایک نیا موقعہ ملا ہے میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی آلودگیوں سے پاک ہو۔ میں نیک مقاصد کے لئے نیک ذرائع کا قائل ہوں۔ پسماندہ طبقات اور بچھڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح و فلاح میرا نصب العین ہے، اور آئندہ بھی رہیگا۔

میرا ایقان ہے کہ خون خرابہ اور لڑائیوں سے
کرۂ ارض کو نجات دلانے کے لئے سچائی اور
عدم تشدد کی اساس پر عوام کے مختلف طبقات
میں محبت اور خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے
اور صدر جمہوریہ کی حیثیت سے میں اس کے لئے کوشاں
رہونگا۔ مجھے احساس ہے کہ ہمارے چاروں
طرف کشیدگی کے آثار نمایاں ہیں۔ میں کوشش
کروں گا کہ کشیدگی کا یہ ماحول باقی نہ رہے، اور
ہم سب کندھے سے کندھا ملا کر اپنے نصب العین کی
تکمیل میں جٹ جائیں۔ مجھے عوام کی مشکلات
و مصائب کا بھی پورا پورا اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں
ہوں کہ غذائی قلت ہمارے ملک میں دائمی وباء
کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ہمیں ان عناصر کے
خلاف جو ہمارے منہ کے نوالے چھین کر اپنی
تجوریوں کا وزن بڑھا رہے ہیں، تمام فروعی
اختلافات کو بھلا کر صف آرا ہونا پڑیگا کیونکہ یہ
لوگ خوشحالی کے دشمن ہیں ـــــ"

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ان کے انتخاب پر مسرت و طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ عوام کی خدمت گزاری نے منتخب صدر کو سبھوں کی محبت، عزت اور خیر سگالی کا مستحق بنا دیا ہے۔ اس وقت کے صدر کانگریس مسٹر کے کامراج کو بھی جو ذاکر صاحب کی نامزدگی سے اختلاف رکھتے تھے کہنا پڑا کہ ذاکر صاحب کو صدر کی حیثیت سے منتخب کر کے قوم نے سیکولرازم پر اپنے ایقان و اعتماد کی توثیق کی ہے

اپوزیشن کے لیڈروں نے بھی عمومی حیثیت سے ذاکر صاحب کے انتخاب پر مسرت کا اظہار کیا بیرونی قائدین نے بھی ذاکر صاحب کے چناؤ کو موزوں ترین شخصیت کے مترادف قرار دیا ان کے لئے یہ بات بھی بیحد قابل ستائش تھی کہ ملک کے سب سے بڑے عہدہ کے لئے اقلیتی طبقہ کے ایک فرد کا انتخاب عمل میں آیا ——— جرمنی میں جہاں ذاکر صاحب نے کافی عرصہ تک تعلیم حاصل کی تھی ان کے چناؤ پر سب سے زیادہ خوشی کا اظہار کیا گیا۔ جرمن اخبارات نے ان کے چناؤ کو سیکولرازم کے علاوہ شریمتی اندرا گاندھی کی شخصی کامیابی کا نام دیا امریکہ میں بھی ذاکر صاحب کے انتخاب کے نتیجہ میں ہندستان کے وقار اور مرتبہ میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذاکر صاحب کے چناؤ سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ہندستان کی قومی قیادت نیک نیتی سے سیکولرازم کے اصولوں پر کاربند ہے

صدر جمہوریہ ہند

۱۳ رمئی ۱۹۶۷ء کو ذاکر صاحب نے صدر جمہوریہ ہند کے عہدہ کا حلف اٹھایا پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں منعقدہ ایک سیدھی سادھی لیکن پر اثر تقریب میں جو ۳۰ منٹ تک جاری رہی اس وقت کے چیف جسٹس آف انڈیا مسٹر کے این وانچو نے حلف دیا حلف برداری کے بعد ذاکر صاحب نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ صدر جمہوریہ ہند کے منصب جلیلہ کے لئے میرا انتخاب کر کے میرے ملک کے عوام نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے وہ میرے لئے سرمایہ افتخار ہے میرے لئے یہ بات بھی کچھ کم باعث افتخار نہیں کہ مجھے ہندستان کے ایک عظیم دانشور ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن کی جانشینی کا شرف حاصل ہو رہا ہے، جو ایک عرصہ سے میرے رہنما اور میرے رفیق و مشیر رہے ہیں، مجھے پانچ برس تک انہی کے تحت نائب صدر جمہوریہ کے فرائض کی انجام دہی کا موقع ملا۔ میں یقیناً ان کے رتبہ اور درجہ پر پہونچ نہیں سکتا۔ لیکن ان کے نقش قدم پر چلنے کی ضرور کوشش کروں گا۔"

عوام کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا

"میں بہ تمام عجز و انکسار، اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے مسائل کی یکسوئی کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دونگا' میں نے ابھی ابھی اپنے ملک کے دستور کی وفا داری کا حلف اٹھایا ہے یہ ایک نسبتاً کم عمر ملک کا دستور ہے' یہ اس ملک کی آزادی کے بعد ترتیب دیا گیا۔ اور ہم سبھوں نے آزاد ہندستان کے آزاد شہریوں کی طرح رضاکارانہ طور پر اسے قبول کیا ہے۔ ہمارا ملک اگرچہ کہ بہت پرانا ہے، لیکن اسے آزادی کچھ عرصہ پہلے ہی ملی ہے ہمارے اسلاف نے جو مختلف نسلی اور تہذیبی گروہوں سے منسلک تھے، صدہا سال کی کوششوں کے بعد بعض منفرد قدروں کو جنم دیا ہے۔ قدروں کے تصور و مفہوم پر زمانی تبدیلیوں کا اثر ضرور پڑتا ہے لیکن قدریں اپنا وجود ضرور باقی رکھتی ہیں، اور ان کے مفہوم پر غالب عصریت کا عنصر انھیں لازوال اور ابدی بنا دیتا ہے۔ ہمارا ماضی مردہ نہیں وہ زندہ اور متحرک ہے اور وہ ہمارے حال کی تعمیر و تشکیل اور ارتقاء میں تاریخی رول ادا کر رہا ہے۔"

۲۰ مئی کو بلدیہ دہلی نے نئے صدر کے اعزاز میں ایک استقبالی جلسہ منعقد کیا اور اس موقعہ پر دہلی کے میئر نے اس امر کا انکشاف کیا کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں ذاکر صاحب

دہلی میونسپل کمیٹی کے انتخاب میں امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا تھا لیکن ریٹرننگ آفیسر نے پہلے ہی مرحلہ پر پرچہ نامزدگی مسترد کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں کام کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اب ہمیں زیادہ تقریروں سے احتراز کرنا چاہیئے اگر ہم متحد رہیں، اور مل جل کر کام کریں تو ہم قومی ذمہ داریوں اور اپنے فرائض کی تکمیل کر سکتے ہیں کسی ایک لیڈر سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہی سارے مسائل حل کر دیگا۔

انتخاب کے موقع پر ذاکر صاحب نے جرمن ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندہ خصوصی کلاس اسٹیبلر کو جو انٹرویو دیا تھا اس میں انھوں نے جرمن زبان سے اپنی واقفیت کا ذکر کرتے ہوئے یاد دلایا کہ انہوں نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک جرمنی ہی میں تعلیم حاصل کی تھی اور سومبارٹ جیسی شخصیت ان کے استادوں میں شامل تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "ژھنلڈورت" کے علاقہ کو جہاں وہ رہا کرتے تھے، انہوں نے اب تک فراموش نہیں کیا ہے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ جرمنی میں ہندستان کا ذکر آتے ہی وہاں کے لوگوں کو ہندو مسلم جھگڑوں اور فسادات کی یاد آجایا کرتی تھی۔ لیکن اب انھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ایک مسلمان اس ملک کے سب سے بڑے عہدہ کے لئے منتخب ہوا ہے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ جرمنی عوام کے اس نظریہ سے سخت اختلاف رکھتے تھے کہ ہندستان " ہندو" اور مسلم جھگڑوں اور مناقشات کی آماجگاہ ہے۔ آزادی کے بعد نو ہندستان نے سیکیولرازم کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے اور اب ہندستان کا کوئی بھی شہری خواہ اس کا کسی مذہب، فرقہ سے تعلق ہو وہ کسی بھی بڑے سے بڑے عہدہ پر مامور ہو سکتا ہے۔ ذاکر صاحب نے اس امر کی بھی وضاحت کی کہ اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے کئی لوگ خاصے بڑے عہدوں پر مامور ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ صدارت جمہوریہ کے عہدہ کے امیدوار کی حیثیت سے ان کی نامزدگی کا ان کے مسلمان ہونے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان سے بعض اور سوالات بھی پوچھے گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ ـــ

ہندستان کی بعض ریاستوں میں مختلف جماعتوں کی حکومتوں کی تشکیل سے ہندستان کے قومی اتحاد کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا کیونکہ پارلیمانی جمہوریت کے نظام میں کوئی خاص جماعت ہی اقتدار کی اجارہ دار بنی نہیں رہ سکتی۔ اگر ایک جماعت بعض ریاستوں میں اقتدار سے محروم ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ملک کے اتحاد کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔"

ذاکر صاحب نے صاف الفاظ میں کہا کہ

"اس صورت حال پر مایوسی کے اظہار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہمارے ملک میں جمہوریت کی جڑیں بہت مضبوط ہو گئی ہیں اور عوام کا شعور بھی بیدار ہو گیا ہے بعض سیاسی جماعتوں کے چند ریاستوں میں برسر اقتدار آنے کو خطرہ محسوس کرنا دراصل ان کی وطن دوستی پر شک و شبہ کے مترادف ہے۔ اور مجھے ان جماعتوں کی نیک نیتی، خلوص اور وطن دوستی پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ میں اپنے ملک کے عوام اور سبھی سیاسی جماعتوں سے اس بات کی توقع رکھتا ہوں کہ وہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے جو ملک کی سالمیت اور اتحاد کے لئے مضرت رساں ثابت ہو۔"

صدرِ جمہوریہ کی حیثیت سے ذاکر صاحب نے اپنے جس نئے دور کا آغاز کیا اس وقت ہندستان کی اجتماعی سیاست ایک شدید بحران سے دوچار تھی کانگریس اپنے جسم پر ابھر آنے والے اس پھوڑے کی ٹیس اور جلن سے بے حال اور نیم جان ہو چکی تھی جس نے بعد میں سینڈیکیٹ کی شکل اختیار کر لی، اور جس کو شریمتی اندرا گاندھی نے ایک بڑے عملِ جراحی کے ذریعہ نکال پھینکا۔ لوگ بار بار پوچھتے تھے کہ کیا یہی وہ آزاد ہندستان ہے کہ جس کے لئے گاندھی جی نے جامِ شہادت نوش کیا اور کیا مسٹر نہرو کے خوابِ سوشلزم کی تعبیر یہی ہے کہ ہم بھوک اور فاقہ کی اذیت میں مبتلا ہیں اور ہمارے بعض غرض مند قائدین جو ہر چناؤ کے موقع پر ہمارے حالِ زار پر مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہیں، راتوں رات کو ٹھیوں کے مالک بن جائیں۔ برلا، ٹاٹا، سنگھانیا اور ڈالر بنتے رہیں اور آزاد ہندستان کی نئی نسل، کلرکی کی تلاش میں سرکاری دفاتر، صنعتی اداروں اور مراکز فراہمی روزگار کے چکر کاٹتی رہے۔ شریمتی سروجنی دیوی کے الفاظ میں اچھی پوشاک کے اندر چھپا ہوا شیطان سینہ تان کر چہل قدمی کر رہا تھا۔ کانگریس بیزارگی کا جذبہ اتنی انتہا پر پہونچ گیا تھا کہ لوگوں نے متعدد ریاستوں میں کانگریس کو اقتدار سے بے دخل کر دیا تھا۔

کانگریس کے اس انحطاط پر ذاکر صاحب کی نظر تھی لیکن انھیں یہ اندازہ بھی تھا کہ کانگریس پر مفادات حاصلہ اور ان کے ایجنٹوں کی گرفت کس درجہ مضبوط ہے ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس عہد کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

> "سارے ملک میں شورش اور بے چینی کا
> دور دورہ تھا، سرکاری اور غیر سرکاری کارخانوں
> اور دفاتر میں کام کرنے والے اسکولوں اور
> کالجوں کے معلم اور طالب علم، مذہبی پیشوا،
> سیاسی رہنما، ان کے پیرو اپنی معاشی

تعلیمی سیاسی، مذہبی شکایتوں کو نہ صرف ارباب اختیار تک پہونچانے کے لئے احتجاج، مظاہرے، ہڑتالیں اور فاقے کر رہے تھے بلکہ ان کو منوانے کے لئے کھلے اور در پردہ تشدد سے کام لے رہے تھے۔ ارباب حکومت شخصی یا اجتماعی رقابتوں اور طاقت کے مقابلوں میں اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ انھیں ان شورشوں کے محرکات کو سمجھنے اور ان سے انصاف اور تدبیر کے ساتھ نبٹنے کی فرصت نہ تھی وہ ان کو نظر انداز کرتے رہتے یہاں تک کہ شورش ہنگامہ بن جاتی۔ پھر اسے طاقت سے دبانے کی کوشش کرتے اور اگر اس میں کامیابی دشوار ہوتی تو خود دب جاتے۔ "

اس دور میں ذاکر صاحب کے لئے جوالہ مکھی بنتے ہوئے ہندستان کی صدارت کی گراں بار ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا اس اثنا میں فرقہ پرستی نے بھی کافی سر اٹھایا۔ ہندو اور مسلمان ملک کے دو بڑے فرقے مایوسی اور بیزارگی کے عالم میں ان لوگوں کے پیچھے چل پڑے جو جذباتی نعروں سے عوام کی توجہ ان کے حقیقی مسائل سے ہٹانا چاہتے تھے۔ ذاکر صاحب مسلمان کو مشورہ دیں کہ ہندستان کے سیکولر ڈھانچہ میں مذہب کا لیبل لگا کر خصوصی حقوق و مراعات کی طلب بے معنی ہے تو اہل صدق و صفا بھی نہیں اور ان جیسے صایب الرائے مسلمانوں پر "سرکاری مسلمان" کی پھبتی کسنے لگیں

صدارت پر انتخاب کے بعد ایک نیک دل آدمی کی طرح انہوں نے ایک بڑے ہندو مذہبی رہنما، کا آشیرواد لیا تو ایک شور برپا ہو گیا۔ مسلمان بھی ناراض، اور ہندو فرقہ پرست بھی ناخوش۔ ایک خندہ استہزا کے ساتھ کہا گیا کہ یہ بھی ایک ڈھونگ ہے لیکن اس آزمائش میں ان کی تربیت و تعلیم ان کے میلان فکر، اور ان کی افتاد طبیعت نے بڑا کام کیا۔ نائب صدارت ہی کے دور میں، وہ ملک کی اقلیت کے مسائل پر ایک مرد مومن کی طرح ارباب مقتدر کی توجہ مبذول کرواتے رہے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ذاکر صاحب کے ذہن میں مسلمانوں کی سیاست کا کیا تصور تھا اور وہ ہندستان میں ان کے لئے کس مقام کی توقع رکھتے تھے خواجہ غلام السیدین نے ان سوالوں کا جواب اپنے ایک مضمون میں دیا ہے۔

ان کے الفاظ میں ذاکر صاحب کو اس تہذیب و تمدن سے گہری اور سچی محبت تھی جو ہندستان میں اسلام کے حیات بخش اثر سے پیدا ہوئی۔ ان کے دل میں اس فلسفۂ حیات کا، اس علم و ادب کا اس معاشرتی نظام کا زبردست احترام تھا جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں اس تہذیب و تمدن اور اس معاشرت و فلسفہ کے اصولوں اور قدروں کو پرکھنے اور ان کی مبصرانہ تفسیر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی، وہ ایک صاحب نظر اور مفکر کی طرح لفظوں کی سطحوں سے نیچے اتر کر معنی کی گہرائیوں تک پہونچ جاتے تھے۔ ان کے اسلامی تصور حیات میں جہاں ایک سچے اور راسخ مسلمان کا عقیدہ جھلکتا ہے وہاں اس میں عصر حاضر کی تحریکوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ان میں تھی عقیدہ نے ان کو بتایا کہ اسلام کے بنیادی اصول چودھویں صدی میں بھی ایسے ہی سچے اور قابل عمل ہیں جیسے وہ پہلی صدی میں سچے تھے۔ لیکن عقل اور تجربہ اور حالات حاضرہ کا گہرا مطالعہ انھیں یہ بھی بتایا ہے کہ جو

چودھویں صدی میں ان اصولوں کا اعلان اور ان کی تنقید چودھویں صدی کے مسائل اور ضروریات کو پیش نظر رکھکر کرنی چاہیئے۔ اسی وجہ سے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی مسائل میں وہ ترقی پسند ہیں۔ ہندستانی مذہب کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ وہ ایک مشترک کارنامہ ہے، اور اس کی نشو ونما میں مختلف جماعتیں اور قومیں اور مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ شریک ہیں، وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اس اجتماعی کارنامے میں جو ایک ہزار سال کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے بہت نمایاں اور قابلقدر حصہ لیا ہے ذاکر صاحب اس مشترک ورثہ کو قائم رکھنے اور مالامال کرنے کے خواہشمند تھے۔ ان کے نزدیک مسلمان کے لئے یہ پوزیشن ہرگز شایان شان نہیں کہ وہ اپنی گذشتہ تاریخ اور روایات سے بےتعلقی اختیار کرلیں اور جس ملک میں انھیں جینا اور مرنا ہے اس کی سماجی اور سیاسی خدمت میں پیش پیش رہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں ظلم ہے، بےانتظامی ہے، جہالت ہے، توہمات ہیں۔ انسانوں میں نسل ورنگ کا امتیاز رائج ہے اس کو دور کرنا مسلمانوں کا مذہبی اور عملی فریضہ ہے۔

ان کے ایک اور دوست پروفیسر مجیب لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو جو بھی دیکھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اتنے قدآور نہیں جتنا کہ ایک مرد آدمی کو ہونا چاہیئے۔ لیکن وہ اپنی قامت کی بلندی کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتے۔ ان کے عمل کا میدان بدل گیا لیکن ان کی شخصیت جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی زندگی تضاد کے دھارے میں بہتی رہی۔ پیدا تو ہوئے وہ امیر گھرانے میں لیکن ایسا مشغلہ اور پیشہ اپنے لئے منتخب کیا جس نے انھیں سالہا سال تک غربت وافلاس میں مبتلا رکھا۔ تعلیم و تربیت حاصل کی اور پینے نو استاد بنے۔ زندگی بھر چمک دمک کی

سیاست سے دور رہے اور ایک مرحلہ ایسا آیا کہ اپنے ملک کے سب سے بڑے اور جلیل القدر سیاسی عہدہ کے لئے منتخب ہوئے ان کی افتادِ طبع امیرانہ تھی لیکن انہوں نے غریب سے غریب آدمی کو گلے لگانے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا۔ ضرورت پڑی تو جامعہ ملیہ کے لئے چندہ وصول کرنے، جھولی لٹکا کر سڑک پر نکل پڑے۔ غیر ضروری باتوں سے انہیں نفرت تھی لیکن جب بحث و مباحثہ پر اتر آتے تو گھنٹوں بولتے۔ انہوں نے اپنی کتاب زندگی کے تمام ابواب و اوراق کھلے چھوڑے ہیں تاکہ پڑھنے والا ان کے تجربات سے استفادہ کرے۔

ان کے سبھی دوستوں 'رفیقوں' بہی خواہوں اور قدردانوں کی مشترکہ رائے یہی ہے کہ ان کی یہ ساری صفات اقبال کے " دانائے راز" اور "مردِ مومن" سے بڑی مشابہت رکھتی ہیں۔ "کمتر برائی" کو قبول کرنے کی منطق انہوں نے زندگی کے کسی بھی مرحلہ پر قبول نہیں کی اور اسی رجحان و اختلاف کے تحت انھیں کمتر درجہ کا حبِ وطن بننا بھی پسند نہیں تھا۔

اپنے دورِ صدارت میں ذاکر صاحب نے سوویٹ یونین کا دورہ بھی کیا تھا یہ ایک حقیقت ہے کہ سوویٹ یونین دنیا کی ایک بڑی طاقت ہی نہیں ایک بڑے نظام حیات کا حامل ملک بھی ہے۔ اس ملک کے غیر طبقاتی سماج کے ارتقاء کی تاریخ ان تمام اقوام اور ممالک کے لئے نیا حوصلہ عطا کرتی ہے جو سوشلزم پر ایقان رکھتے ہیں۔ جواہر لال نہرو نے تو ۱۹۲۶ء ہی میں سوویٹ یونین کو ساری دنیا کے محنت کش طبقات کا مرکز نظر قرار دیا تھا۔ ذاکر صاحب نے اپنے انتقال سے ایک سال قبل جولائی ۱۹۶۸ء میں سوویٹ یونین اور وسط ایشیا کی سوویت جمہوریتوں کا دورہ کیا تھا۔ سوویٹ یونین کے معمار اول لینن کے رہائشی مکان کے معائنہ کے بعد کتاب الرائے میں ذاکر صاحب نے

جو چند سطریں لکھی ہیں، وہ محنت کشوں کے اس عظیم قائد اور اس کی تعلیمات سے ذاکر صاحب کی بے اندازہ عقیدت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھا

"اس جگہ کی زیارت کرنا جہاں سارے
جگوں کے ایک عظیم ترین انسان، ایک
نئے روس کے رہنما اور ایک نئی دنیا کے
رہبر رہتے اور کام کرتے تھے، ایک خاص
اچھا تجربہ تھا۔"

لینن کی یہ رہائش گاہ کریملین کے احاطہ میں واقع ہے۔ اس میں دولت و جواہرات کے ڈھیر ہیں نہ سونے اور زمرد کے انبار نہ طلائی فریم میں جڑی ہوئی قد آدم تصویریں، نہ مرعوب کن ماحول اس کے در و دیوار ایک عظیم انسان کی سادگی اور نیک دلی کی داستان سناتے ہیں ایک بڑی میز جس پر ایک قلمدان دھرا ہے، کاغذ تراش ایک موم بتی، ایک بید کی کرسی، روسی اور دیگر زبانوں کی کوئی دو ہزار کتابیں یہ وہ جگہ ہے لینن نے ۱۱ مارچ ۱۹۱۸ء سے ۱۲ دسمبر ۱۹۲۲ء تک یعنی ٹھیک اس دن تک کام کیا۔ جب وہ اپنے آپ کو بیمار محسوس کرنے لگے تھے۔ کرسی سے اٹھے اور کمرہ سے اس طرح نکلے کہ پھر کبھی واپس نہ آئے اس وقت ۸ بجکر ۵ منٹ ہو چکے تھے اور آج بھی دفتر کی گھڑی میں یہی وقت نظر آتا ہے۔

ذاکر صاحب نے اس کمرہ کی ایک ایک چیز کا بڑی دلچسپی سے معائنہ کیا۔ کمرہ کے وسط میں ایک لمحہ کے لئے سر جھکائے کھڑے رہے اور باہر نکلے تو آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ذاکر صاحب نے لینن گراڈ میں چند دن گذارے اور اپنے مختصر سے قیام کے دوران "لیکاریوسکویہ" کا وہ یادگار قبرستان دیکھا جہاں نازیوں کی مدافعت کرنے والے ۴ لاکھ ۷۰ ہزار مجاہدانِ وطن موت کی نیند سو رہے ہیں۔ یہ وہ مجاہدان

صف شکن ہیں جنھوں نے ۹۰۰ دنوں تک اس شہر کا دفاع کیا تھا۔
ذاکر صاحب نے "مغموم مادر وطن" کی یادگار پر پھول چڑھائے اور ایک لمحہ تک سر جھکائے کھڑے رہے۔ سودیٹ یونین کے ایک اکیڈیمیشن اور دانشور نے جو ذاکر صاحب کو اس یادگار کے آگے اس عالم میں دیکھ چکا ہے اس ایک لمحہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"اس سفید بالوں والے پرکشش انسان
نے زبردست تجربہ کے حامل انسان نے
اس وقت کیا سوچا، جب وہ احترام کے
ساتھ سر جھکائے کھڑا تھا؟۔ یہ تو وہی
جانتا ہے لیکن اس کے خیالات کا علم
کتاب الرائے میں چھوڑے ہوئے اس نقش
سے ہوتا ہے "۔ اس مقدس مقام پر حاضری
میری زندگی کا ایک انتہائی اثرانگیز
تجربہ رہی۔ غم و رنج کی جگہ یقیناً ایک بہتر
دنیا کے عالم وجود میں آنے کی امید کی جگہ بھی ہے،
یہ دنیا کے اس عزم کی ترجمانی کرتی ہے
کہ اس قسم کی باتیں اب کبھی دُھرائی نہ جائینگی
نہیں۔ نہیں۔ کبھی نہیں۔"

ہندستان نہ جانے کب سے جنگ اور استحصال سے پاک دنیا کے عالم وجود میں آنے کی راہ دیکھتا رہا۔ کالنگا کی لڑائی سے لیکر سال ۱۹۷۱ء کی ہند۔ پاک لڑائی تک اس نے ہر مرحلہ پر دوستی اور خیرسگالی کے جذبہ کا مظاہرہ کیا۔ سکندر کے آگے سونے کی روٹیاں پھینکر پورس نے اس کے اندر کے انسان کو زر و جواہر کی حرص و

ہوس میں بے گناہوں کی لاشوں کے پشتے لگانے کے غیرانسانی طریقہ کار کے خلاف آمادہ بغاوت کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر شملہ میں اس انسان کو جس نے ایک ہزار برس تک ہندستان سے لڑائی جاری رکھنے کا دعویٰ کیا تھا، مروت اور اخلاص کے مظاہر سے راہ راست پر لایا گیا اور اس سے سردار جعفری کے الفاظ میں کہا گیا

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لیکر

اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟ سب کا دشمن کون ہے؟

یہ بات بھی کھل کر کہہ گئی، اور اس طرح ذاکر صاحب کی اس تمنا کی نمائندگی اور ترجمانی کا ایک نیا واقعہ بھی ہماری تہذیب کی تاریخ میں ایک نئے اور شاندار باب کا بھی اضافہ بھی کرچکا ہے۔ سوویٹ یونین کے دورہ پر روانگی سے قبل ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ ہماری ...... سرزمین کے کلچر نے بے پناہ مادی وسائل اور اس طریق عمل سے واقفیت حاصل کرنا ان کا مقصد ہے جس کے ذریعہ سوویٹ عوام جو ایک سو سے زیادہ قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں مختلف ثقافتوں اور روایتوں کے حامل ہیں، ایک مضبوط اور متحد قوم بن گئے ہیں۔" ان کے پاس وقت تھوڑا تھا۔ پھر بھی انہوں نے سوویٹ یونین کو اچھی طرح سے گھوم پھر کر دیکھنے کی کوشش کی۔ تبلیسی اور دوشنبے میں انہوں نے "معاشی کامیابیوں کی نمائشیں دیکھیں" اور ان نمائشوں کے معائنے کے وقت نہ جانے کتنی مرتبہ ان کی زبان سے "حیرت انگیز اور عظیم الشان" کے الفاظ نکلے۔

ازبکستان کی خاتون صدر جمہوریہ نصیرالدینوا سے اس ملک کے محنت کش عوام کی ترقی پر تفصیل سے تبادلہ خیال کیا۔ جس کی اکثریت عقیدہ اور مذہب کے اعتبار سے مسلمان ہے۔ دوران گفتگو، ذاکر صاحب نے پوچھا " زلزلہ کی تباہ کاریوں پر آپ کس طرح قابو پا رہے ہیں۔" یہ وہ دور تھا جب کہ زلزلہ نے تاشقند کو

زیر و زبر کر دیا تھا فلک بوس عمارتیں چشم زدن میں زمین پر آرہیں ہزاروں افراد زلزلہ کے ان جھٹکو کی نذر ہو چکے تھے۔ لیکن چند ہی دنوں بعد ایک نیا شہر مسکرا رہا تھا۔ ذاکر صاحب کی لیموسین تاشقند کی چوڑی چکلی کشادہ سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ نئی موٹروں کے ایک قافلہ کے ساتھ۔ یہ سارا قافلہ "چلن زار" کی طرف جارہا تھا جو کئی منزلہ عمارتوں کا ایک کاروباری علاقہ ہے۔ اس کی تعمیر جدید کے لئے سوویٹ یونین کے گوشہ گوشہ کے عوام نے اپنی رضاکارانہ محنت کا پیش کیا تھا۔ اور اس طرح زلزلہ نے جو تباہی مچائی تھی وہ لاتعداد انسانی ہاتھوں کی صناعی کے مقابلے میں بے نام ونشان ہوکر رہ گئی تھی۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
خیاباں و گلزار و باغ آفریدم

ذاکر صاحب کی اچٹتی ہوئی نظر ایک مکان کی دیوار پر پڑی جس پر لکھا تھا

"تاشقند والوں کی فلاح کے لئے بیلوروس کے عوام کی طرف سے"

ایک دوسرے مکان کی دیوار پر تحریر تھا "لینن گراڈ والوں کی طرف سے تاشقند والوں کے لئے" اور پھر ذاکر صاحب کی موٹر اس سڑک پر سے گذرنے لگی جسے زلزلے نے بالکل تباہ کر دیا تھا لیکن جسے ترکمانی مزدوروں نے دوبارہ تعمیر کر دیا تھا۔

تاشقند ہی وہ پہلا سوویٹ شہر تھا جس نے ماسکو جاتے وقت ذاکر صاحب کا استقبال کیا تھا اور یہی وہ آخری شہر بھی تھا۔ جہاں ان کے سرکاری دورہ کا اختتام ہوا اور جس نے سوویٹ یونین اور ہندستان کی دوستی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ انہوں نے رخصت ہوتے وقت کہا۔

"سوویٹ دیس کو میں سلام اور نیک خواہشات کا تحفہ دے رہا ہوں۔ اس ملک کے دورہ کے

بعد وہ دوستی اور یگانگت میرے دل پر
نقش ہوگئی ہے جو سوویٹ عوام کے دل میں
ہندستان والوں کے لئے موجزن ہے
مجھے یقین ہے کہ دونوں ممالک ایک دوسرے
کی دوستی کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اس لئے
اس کی بنیاد باہمی احترام اور مشترکہ انسانی قدروں
پر ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہماری دوستی ہمارے
ملک کے مفاد کے عین مطابق ہے بلکہ یہ دنیا
کے لئے بھی ایک اہم عنصر ہے۔ اپنی قوموں
کے درمیان خیر سگالی اور دوستی کے مضبوط
رشتوں پر ہم جتنا بھی خوش ہوں کم ہے پھر
بھی ہمیں اس سے مطمئن ہو کر اس کی ترقی
سے غافل نہیں ہو جانا چاہئے۔ ہمارے
ملکوں کو اور دونوں ملکوں کے ان لوگوں کو
جو ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں اس دوستی کے
رشتہ کو مضبوط تر بناتے رہنے کے لئے کوشاں
رہنا چاہئے۔"

ایک شائستہ صاحب نظر مصنف

سوویٹ یونین کے دورہ سے واپسی کے بعد ذاکر صاحب تقریباً ایک سال تک حیات رہے۔ ان کی سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات بدستور جاری رہیں۔ صحت کا معیار بھی قائم تھا اور کوئی باور نہیں کر سکتا کہ ذاکر صاحب کا وقت رخصت

آگیا ہے۔ ایک باذوق اور شائستہ انسان کی طرح اپنی سرکاری، اور سیاسی مصروفیات کے باوجود ذاکر صاحب کی فنون لطیفہ سے دلچسپی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ شیکسپیر سے لیکر سارتر تک اور مولانا روم سے ڈاکٹر اقبال تک شعر و ادب کا کوئی مسئلہ چھیڑ دیجئے، ایسے گھنٹوں بولتے رہیں گے۔ بہت کم لوگوں کو شاید اس کا علم ہے کہ ذاکر صاحب مغربی اور ہندستانی دونوں طرح کی موسیقی سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ان کا کتب خانہ جہاں ان گنت نئی اور پرانی کتابوں اور مخطوطات کا حامل تھا۔ وہیں انہوں نے ایک ریکارڈ لائبریری بھی بنا رکھی تھی۔ پال راٹبسن استاد بڑے غلام علی خاں، استاد ولایت علی خاں سے لیکر لتا منگیشکر، رفیع اور عصر حاضر کے بیلے بیک سنگروں تک، ہر ایک کے گائے ہوئے شاہکار ریکارڈ ان کی اس لائبریری میں موجود تھے

ذاکر صاحب اپنی بے پناہ مصروفیات سے کچھ نہ کچھ وقت نکال کر انھیں سن لیتے اور اگر کوئی ساتھ ہوتا تو اسے مشرقی اور مغربی موسیقی کے "رموز و نکات" سے بھی واقف کراتے۔

گلاب کے پھولوں کے وہ بہت رسیا تھے، انہوں نے "صحن جامعہ" کو ایک خوبصورت باغیچہ میں تبدیل کیا۔ علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو اسے لالہ زار بنا دیا سنہ ۱۹۶۰ء میں راشٹرپتی بھون ان کا مسکن بنا تو اس کے لانس پر نیا نکھار آگیا۔ پتھروں اور چٹانوں کو جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور انہوں نے لگ بھگ پندرہ سو نایاب پتھروں کا ایک ذخیرہ رکھ چھوڑا تھا۔ ان میں سے کئی ایک ایسے پتھر تھے جو بیرونی ممالک کے دورہ کے موقع پر ان کے ہاتھ لگے اور جنھیں وہ بڑے جتن سے اپنے ساتھ لے آئے۔ ڈاکٹر رشید احمد صدیقی کے مطابق ذاکر صاحب مدت دراز سے اپنی پسند کے فارسی اشعار ایک بیاض میں درج کرتے رہتے تھے جن کی مجموعی تعداد کئی ہزار تک پہونچ چکی تھی۔ یہ بیاض ہر طویل سفر میں ان کے ساتھ رہتی تھی

ان کی تحریروں کے بارے میں ڈاکٹر رشید احمد صدیقی جن کا شمار بے رحم نقادوں میں ہوتا ہے، یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ذاکر صاحب نے فکر و نظر کو اشارداری کے رقص و رامش میں اس طرح تحویل کیا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس طرح کی رہین منت ہے۔ مدت ہوئی کہیں ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے غالب کا یہ مصرعہ لکھا تھا

ع ریحان و مدار مینا رامش چکیداز قلقل

ذاکر صاحب کی قابلیت و ذہانت کا اظہار یوں تو ہر موقع پر ہوتا رہتا ہے لیکن بدیہہ آفرینی اور برجستہ جوابی کے الماس ریزے اور برق پارے اس وقت دیکھنے میں آتے ہیں جب وہ حریف کی نامعقولی یا نالائقی پر برہم ہو جائیں۔" افلاطون کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی ذات ایسی تھی جس میں معلم اور مفکر کا تضاد غائب ہو گیا تھا اور اس کی شخصیت کے علمی اور نظری پہلو دونوں آکر جمالیاتی کمال میں مل گئے ہیں۔ یہی بات خود افلاطون کی کتاب "ریاست" کے اردو مترجم ذاکر صاحب پر چسپ بیٹھتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ذاکر صاحب کی ادبی خدمات پر اپنے ایک سرسری مضمون میں لکھا ہے

"ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ایک مفکر کی تابانی فکر ایک معلم کی شفقت و مرحمت، ایک عاشق کا سوز و گداز، ایک مدبر کا وزن و وقار ایک صوفی کی درویشانہ شان ایک مہاتما کی سی معصومیت سب کا جلوہ نظر آتا ہے فلسفہ اقتصادیات، ادب، سائنس، تعلیم تصوف مذہبیات ہر موضوع پر ان کا مطالعہ گہرا اور ان کا علم حاضر تھا۔ وہ اگر صرف مصنف یا معلم

ہوتے تو بھی ان کا درجہ بہت بڑا ہوتا۔ مگر
ان کی سیمابی فطرت نے کبھی تصنیف و تالیف
کے گوشہ عافیت پر قناعت نہیں کی۔ انہوں نے
جوش جنوں میں بارہا گھر چھوڑ کر جنگل کی راہ لی
اور اپنے خون دل سے کتنے ہی ویرانوں میں علم
و عمل کے پھول کھلائے لیکن اپنے آپ کو کتابوں
میں بند نہیں کیا۔ مگر جب کبھی کچھ لکھا تو اپنے
خلوص، دل سوزی، اور سماجی شعور کی وجہ سے
الفاظ میں وہ لیسی ہوئی بجلیاں بھر دیں جن کی وجہ
سے ادب میں آب و تاب آتی تھی۔ اور جن سے
انسانوں کی زندگی بدلتی، سنورتی اور نکھرتی ہے"

ذاکر صاحب کی پہلی قابل ذکر کتاب افلاطون کی شہرہ آفاق تصنیف "ریاست" کا اردو ترجمہ ہے۔ اور اس کے متعلق مولانا اقبال احمد سہیل کی یہ رائے ہے کہ "افلاطون کو اردو آتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا" اس کے پر مغز مقدمہ میں ذاکر صاحب نے اردو دنیا کا تعارف ایسی نثر سے کرایا ہے کہ جسے پڑھ کر انسان وجد کرنے لگتا ہے۔ جرمنی میں پروفیسر زومبارٹ جیسے دانشور کی شاگردی نے انھیں معاشیات کا ماہر اور معلم بنا دیا چنانچہ ان دوسری قابل ذکر تصنیف "معاشیات ــ مقصد اور منہاج" ان کے اسی رجحان کی ترجمانی کرتی ہے' یہ بظاہر ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن سہل، سلیس اور رواں دواں زبان میں ذاکر صاحب نے اردو والوں کو معاشیات کی مروجہ اصطلاحوں اور اصولوں سے واقف کرانے کی اس کوشش کو ایسا کوئی بھی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا جو اردو کو ایک بھرپور سائنٹفک زبان کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے

تعلیم کے تو وہ بہت بڑے امام مانے جاتے ہیں۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز انہوں نے

قومی تعلیم کے تجربہ سے کیا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے " اس شوقِ فضول کو جرأتِ رندانہ اور جرأتِ رندانہ کو عین ہوشمندی بنایا" یہ " اس تجربہ بصیرت، علم اور عرفان کا ثمرہ " اردو کی وہ کتاب ہے جو " تعلیمی خطبات " کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب ان کی اصابت نظری، بالغ النظری، حب الوطنی اور سماجی شعور کی آئینہ دار ہے۔ استاد کیا ہوتا ہے؟ ذاکر صاحب کی زبان سے اس سوال کا جواب سنیئے

"استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا — محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے، سماج سے محبت ہوتی ہے۔ اس کی روح میں حق و صداقت حسن و جمال انصاف، و آزادی کے مظاہر کی گرمی ہوتی ہے جس سے وہ دوسرے دلوں کو گرماتا ہے

اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو نکھارتا ہے۔ اچھے استادوں میں اہلِ قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں، اور ان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ حکمران جبر کرتے ہیں اور یہ صبر کرتا ہے وہ مجبور کر کے لوگوں کو ایک راہ پر چلاتے ہیں، اور یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے۔ ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے، اور دوسرے کا شوق سے۔ ایک حکم دیتا ہے دوسرا مشورہ وہ غلام بناتا ہے۔ یہ ساتھی۔ جب ساری دنیا

مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہوتے ہیں۔
جن کے سینہ میں امید باقی رہتی ہے — ایک
اس کی ماں دوسرا اچھا استاد۔ "

تعلیمی خطبات کے ہر صفحہ پر ایسے کتنے ہی جواہر پارے دامن نظر پکڑ لیتے ہیں جن کا طرز بیان "پینترا" نہیں، طلسم سازی نہیں، شخصیت کے جلوہ صدرنگ کی آب وتاب ہے اور بقول آل احمد سرور صاحب

" اس میں فکر کی پیشانی کا جمال، فن کار کے
خونِ جگر کی شوخی اور ایک فرشتہ صفت انسان
کی دردمندی اور دل سوزی کی گرمی اور حلاوت ہے

یہ طرز بیان ایک حسینہ کی بلساختہ ادائے
دلبری ہے یا ایک مجاہد کی بے جھجک تیغ
آبدار اس میں آمد ہی آمد ہے اور دکاوش کا
پتہ نہیں — "

ذاکر صاحب کے بیشتر مضامین رسالہ "جامعہ" میں شائع ہوتے رہے ہیں انھیں اب تک یکجا نہیں کیا گیا ہے اگر ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو جائے تو اندازہ ہوگا کہ ذاکر صاحب کی "ادبی قامت" بھی کتنی بلند تھی۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی بہت سی کہانیاں لکھیں ان میں "ابو خاں کی بکری" کے علاوہ "پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی"، "مرغی جو اجمیر چلی" اور "عقاب" کافی معنی خیز ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھیں بچوں کے علاوہ جوان اور بوڑھے بھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ ذاکر صاحب نے "آزادی" وطن دوستی اور انسانیت کے جذبات کو مہمیز لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے لیکن ان کے پس پردہ کوئی طنز نظر نہیں آتا۔ کیونکہ ذاکر صاحب کے لئے طنز نگار بننا ہی ممکن نہ تھا ان کا نظریہ یہ تھا کہ "اس میں بڑا مزہ ہے کہ آدمی، آدمیوں کے متعلق اچھے سے

اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے۔ ہر روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین رکھے اور عقل مندوں کو اور بے وقوفوں کو کہ دونوں گمراہ ہو، تے ہیں۔ معاف کرے "۔۔۔ اس نظریہ کا حامل کوئی شخص کسی پر طنز ہی نہیں کر سکتا۔

پروفیسر محمد سرور نے جو جامعہ ملیہ میں تاریخ اسلام کے استاد ہیں۔ ذاکر صاحب کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

"ان کی تحریر میں عام ہمہ گیری ہے۔ ایسی ہمہ گیری جو محض کتابوں سے مستفاد نہیں۔ بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے ماخوذ ہے۔ ان کا احساس بہت تیز ہے اور قوت فکر بڑی جولاں اس طبیعت کا آدمی اکثر حقایق کے مقابلہ میں اپنی فکر کی دنیا بنا لیتا ہے۔ اس کی پرواز عرش بریں سے بھی پرے تک جاتی ہے وہ یزداں کو بے شک کمند میں لے آتا ہے لیکن یہ دنیا کوتاہیوں کی دنیا، بے عملیوں اور باتونیوں کی دنیا، مکر و ریا کی دنیا۔ کبھی ظلمت اور کبھی نور کی دنیا ہے۔ وہ اس کی الجھنوں اور گتھیوں کو نہیں سمجھتا۔ ذاکر صاحب اپنی طبیعت کی اس افتاد سے واقف تھے انہوں نے اس کے خلاف زبردستی ریاضت اور مجاہدے کے طور پر حقایق کی دنیا میں اپنی جگہ بنائی اور سالہا سال تک علم و ادب کی

بلند پروازیوں سے دور ہے ۔ اس ریاضت
اور مجاہدہ کے نتیجہ میں انہوں نے ایک ایسے
ادب کو جنم دیا جو ایک طرف انگریزدانیت ہے
جو ان کی خداداد ذہانت اور فطری طباعی کا حاصل
ہے تو دوسری طرف زندگی کی حقیقت ، اور
مادیت ہے ۔"

اردو سے ذاکر صاحب کو فطری لگاؤ تھا ۔ ہندستان کے سب سے بڑے منصب جلیلہ پر پہونچنے کے بعد بھی وہ مجبوری کی صورت میں ہی انگریزی بولتے تھے ۔ اردو سے ان کے اسی طبعی لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے جرمنی کے اردو سے نامانوس ماحول میں بھی کاویانی پریس برلن سے دیوانِ غالب ، رباعیات عمر خیام اور دیوانِ شیدا کے خوبصورت ٹائپ ایڈیشنوں کی اشاعت کا اہتمام کیا ۔ وہ بہت عرصہ تک انجمن ترقی اردو کے صدر رہے اور راجیہ سبھا کی رکنیت کے دوران ، اتر پردیش کی حکومت کو وہ یادداشت بھی پیش کی جس کے ذریعہ ، اردو کو اتر پردیش کی دوسری علاقائی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا ۔ صدر جمہوریہ کی حیثیت سے جب چند دنوں کے لئے حیدرآباد آئے تو ، اردو ہال گئے ___ اردو اورینٹل کالج کے مسائل پر کالج کے ارباب مجاز کی باتیں پوری توجہ اور انہماک سے سنیں ___ ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ دیکھا ۔ ریاست میں اردو کے موقف کے تعلق سے ضروری معلومات حاصل کیں ___ وہ زندگی بھر اردو کو اس کا مستحقہ مقام دلانے کے لئے سرگرم رہے
زندگی کے اس مجاہد کو قلم ہاتھ میں لے کر فرصت سے اپنے افکار کو کاغذ پر منتقل کرنے کی مہلت ہی کہاں ملی ۔ سخت مصروفیت کے زمانے میں مجبور ہو کر ، راتیں آنکھوں میں کاٹ کر صحت کی خرابی مول لیکر اپنے خون جگر سے جو کچھ بھی لکھا

اردو میں لکھا۔ ان کے ساتھی پروفیسر غلام السیدین نے بالکل درست لکھا ہے کہ ذاکر صاحب کا شمار ان گئے چنے لوگوں میں ہے جن پر قدرت نے صورت اور سیرت، دل اور دماغ، شرافت اور ذہانت، دوستی اور قیادت کی غیر معمولی صفات، ارزاں فرمائی ہیں۔ لیکن وہ اس کو اس استغنا، خود اعتمادی اور سادگی کے ساتھ برتتے ہیں کہ کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور گہری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کی بلندی، اور عظمت گراں نہیں گذرتی۔ یہ چیز بجائے خود انسانی شرف کے لئے ایک بڑی سخت کسوٹی ہے ذاکر صاحب ان لوگوں میں نہیں تھے جو اپنی بزرگی کی دکان لگا کر بیٹھتے ہیں اور خریداروں کو بہ اصرار وہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو شاید خود بھی اپنی قدر و قیمت کا پورا احساس نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو ایسا ہی جیسا کہ دو گلاب کے پھول یا شب مہتاب کو ہوتا ہے۔ یعنی ان کے لئے خوشبو دینا اور روشنی پھیلانا عین فطرت ہے اس کے لئے کسی تعریف یا معاوضہ کا مطالبہ ان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا" ان کے اس رویہ نے چمن زار اردو کے کتنے ایسے پھولوں کو ترو تازگی عطا کی جنھیں ناموافق موسم نے مرجھا دیا۔

جناب سکندر علی وجد نے اعتراف کیا ہے کہ اگر اپریل ۱۹۵۷ء میں ذاکر صاحب ان کا حوصلہ نہ بڑھاتے تو ان کی شاعری ختم ہو جاتی۔ بعد میں انہوں نے اپنا دیوان ذاکر صاحب کو تحفتاً پیش کیا اور ذاکر صاحب نے رات بھر جاگ کر سارا دیوان پڑھ لیا۔

دوسری صبح جب انہوں نے ذاکر صاحب سے ملاقات کی تو انہوں نے ان کے دیوان میں کتابت کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ اسی ایک واقعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ذاکر صاحب کو شعر و ادب اور حکمت و فلسفہ سے کتنی دلچسپی تھی۔ اور سیاست کے خارزار میں الجھ جانے کے باوجود وہ اردو کے شاعروں اور

ادیبوں اور مصنفوں کی تازہ تخلیقات کو پڑھنے کیلئے کسی طرح کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتے
مصوری سے بھی انھیں کافی دلچسپی تھی اور عصر حاضر کے سرکردہ مصوروں
حسین، گجرال، رام کمار، اور کھنہ کی تخلیقات انھیں بہت پسند آتیں
سنہ ۱۹۵۱ء کی دہلی کی ایک نمائش میں ذاکر صاحب کی حسین سے ملاقات ہو گئی
اس نمائش کا افتتاح ڈاکٹر تاراچند نے کیا تھا۔ اپنی شخصیت کا خیال کئے
بغیر ذاکر صاحب نے اپنا تعارف خود حسین سے کرایا۔ "خاکسار کو بھی
حسین کہتے ہیں" اس کے ساتھ ہی انہوں نے حسین کے فن کو خراج
تحسین پیش کیا۔ اور جب تک زندہ رہے، حسین سے ان کا ربط ضبط باقی و
برقرار رہا۔

ذاکر صاحب کا مذہبی نقطۂ نظر

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ذاکر صاحب کے صدارت پر انتخاب پر پرمسرت
اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ہندستان نے ایک مسلم کو صدر جمہوریہ منتخب
کرکے کچھ تو لاج اپنے سیکولر ہونے کی رکھ لی
اس مبارکباد کے مستحق صرف صدر موصوف
نہیں ان کے انتخاب کرنے والے بھی ہیں
ہمارے ذاکر صاحب کی سیرت و کردار کا خلاصہ
کوئی ایک لفظ میں اگر کر دینا چاہیں تو
وہ ایک لفظ شرافت ہوگا۔ شرافت لفظ کے
نمونے یوں تو وہ زندگی بھر اور بکثرت پیش کرتے
رہے لیکن اس کا سب سے بڑا اور سب سے پر اثر

جلوہ تو ان ہی کے الیکشن کے سلسلہ میں دیکھنے
میں آیا۔ معاندین میں بعض تو رذالت کی جس
سطح پر اتر آئے تھے اس پر ہر آنکھ حیراں اور
ہر کان دنگ تھا۔ اتنے صبر آزما حملوں کا جواب
اس پروقار خاموشی سے دینا بس انہی کا حصہ
تھا بقول شاعر ؎

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ میری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی "

صاحب صدق" مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسی مذہبی شخصیت کی نگارشات کے اس آئینہ میں ذاکر صاحب کا جو چہرہ ابھرتا ہے اس سے ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے یہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں کہ ہندستان کے سوشلسٹ قائدین کو مسلم لیگ کے فتنہ پرور شباب کے دنوں میں جس درجہ مسخ کر کے پیش کیا جاتا رہا اور جس بے رحمی سے ان کے قتل کردار کی مہم چلائی جاتی رہی اس کے اثرات آج تک باقی ہیں اور انھیں "سرکاری مسلمانوں کا تحفہ" دیا جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی ذات بھی طنز کے ان "نشتروں" سے محفوظ نہ رہ سکی۔ لیکن ان کی شرافت نفس کے آگے یہ نشتر کچھ زیادہ کام نہ کر سکے۔ ذاکر صاحب کی مذہبیت مختلف نوعیت کی تھی۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کے مذہب کا تصور دوسرا تھا۔ ان کے دل و دماغ پر تو مذہب کی گہرائی کی چھاپ تھی وہ مذہبی ان کے مفہوم سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خطبہ میں کہا ہے کہ

"مذہب ــــ کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی
کا مرکز رہ چکا تھا۔ چھوٹتا تو کیسے۔ مگر اس
طرح قائم رکھا جانے کے دوسرے ارادوں میں

بھی مانع نہ ہو۔ اور ترقی کی راہ میں حائل
نہ ہونے پائے۔ معاملات پر کہ اہل دنیا سے
متعلق نہیں۔ اس کی تعلیمات اور حکمتوں کو
زیادہ ابھارا نہ جائے۔ چپ چپاتے دوسرے
دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب عمل
کو اختیار کیا جائے البتہ عقائد و عادات پر زبانی زور رہے
اور عملاً رخصت اور وہاں احساس مذہبیت کے
باب میں خود فریبی کے لئے مذہب کے ان حصوں پر جو ماورائے
عقل ہیں عقلی بحثیں بھی ہوتی رہیں تو مضائقہ نہیں
یعنی بقول اقبال ؎

محو رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے "

ذاکر صاحب اس قسم کی مذہبیت اور مذہبی تعلیم کے قائل نہیں تھے۔ ان کی نظر میں مذہب اور قدر اہم اور بنیادی چیز ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی کی تمام دوسری قدریں، دوسرے اغراض، دوسری مصلحتیں بے وزن ہیں۔ اگر وہ روح کی نفی کریں۔ وہ مذہب کے معاملہ میں کسی دکھاوے کے انتظام سے اطمینان قلب حاصل کرنے کو نہ صرف ذہنی بددیانتی سمجھتے ہیں بلکہ گناہ۔ دوسری طرف ان کے تصور مذہب میں کسی قسم کی تنگی اور تنگ نظری کے لئے کوئی جگہ نہیں نکلتی۔ پروفیسر غلام السیدین کے الفاظ میں "اگر ایک اچھے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن، اپنے مذہب اور فلسفہ، اپنے ادب اور آرٹ کے خزانوں سے انسانی تہذیب کے کیسہ کو مالامال کرے۔ اگر ایک اچھے ہندستانی ہونے یہ مطلب ہے، کہ وہ ایک روادار، فراخدل، اور سچے معنوں میں مہذب انسان ہو، اگر تعصب، تنگ نظری خود غرضی، افراد اور جماعتوں دونوں کے لئے بری ہیں۔ اگر حق کی حمایت انسان کا فرض ہے

خواہ اس میں اپنوں کا ساتھ چھوڑنا پڑے۔ اگر باطل سے جنگ کرنا ضروری ہے خواہ سارا زمانہ اس کی تائید کرتا ہو۔ اگر انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ان اپنا اور غیروں کا احتساب سختی اور غیر جانب داری سے کرے، اور حق کے معاملے میں نہ اپنا، اپنا ہو نہ غیر غیر۔ اگر یہ سب باتیں درست ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ تعلیم کے ذریعہ ذاکر صاحب جن قدروں کی اشاعت کرنا چاہتے تھے، وہ صرف...... ہندستانیوں کے لئے بلکہ عام انسانیت کے لئے قابل قدر رہیں۔"

ذاکر صاحب اسلام کے اس بیکراں تصور کو محدود کر کے مسلمانوں کے "اسلامی اور پیغمبرانہ فرض" کی حد بندی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ قرآن شریف کو انہوں نے اپنے اصول وعمل دونوں ہی کا سرچشمہ بنائے رکھا۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "تم میں ایک ایسی اُمت ہونی چاہیئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے انھیں نیک کام کرنے کی ترغیب دے اور برے کاموں سے روکے"۔ بلاشبہ بھلائی کی طرف بلانے کا کام بڑا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے بدی سے روکنا بھی ضروری ہوتا ہے ذاکر صاحب نے بڑے حوصلہ اور جرأت سے اس فریضہ کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا کرلی تھی وہ بڑے ہمت سے کہتے تھے کہ "غلط قومیت" اور "اسلام" ایک دوسرے کی نقیض ہیں لیکن سچی قومیت میں جو وطن کی محبت اور اس کی خدمت کو ایمان کا جزو سمجھتی اور مذہب کی حقیقی روح میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں۔ انھیں دیکھکر ہی یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ بیک وقت ایک اچھا مسلمان، اور اچھا ہندستانی ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں جو شخص اچھا مسلمان ہوتا ہے وہ نہ تو غلط اور تنگ نظر قومیت کے لیے اپنے ظرف اور ضمیر کا سودا کرتا ہے اور نہ مذہب کو اس تنگ نظری اور ناروادار کی آڑ بنا کر تاریخی ارتقاء کے سلسلہ میں حارج ہوتا ہے۔ انھیں یہ بات یقیناً پسند نہ تھی کہ مسلمان خود کو قومی زندگی کے دھارے سے الگ تھلگ رکھے لیکن اسے بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی ہندستانی کی زندگی اور تہذیب میں سے ان قابل قدر عناصر کو نکال دے جو مسلمانوں نے گذشتہ ایکہزار برس میں ہندستان کو بخشے اور عطا کئے ہیں۔ مولانا آزاد کی طرح مسلمانوں کے بھرے اجتماع میں وہ ایسی کڑوی باتیں کہتے تھے جن سے شہرت

اور معقولیت کے پیچھے بھاگنے والے نام نہاد مسلم زعما جان بوجھ کر یہ پرہیز کرتے ہیں لیکن جب وہ کسی غیر مسلم اور بالخصوص فرقہ پرست غیر مسلم سے گفتگو کرتے تو اس بات کا بار بار اعادہ کرتے کہ وہ پکے مسلمان ہیں اور انھیں اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۵ء کے اس دن کا تصور کیجیے کہ جب ذاکر صاحب نے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسہ تقسیم اسناد کو مخاطب کیا تھا۔ فرقہ پرستی کا زور ــــ اور کاشی ودیا پیٹھ ایک ایسا مقام جہاں اس زمانہ میں بہت سے مسلمان جانے سے بھی کتراتے لیکن ایک بندۂ حق آگاہ نے ہندو حضرات کے اس اجتماع میں ذاکر صاحب کے بہ ظاہر انکسار لیکن بہ آواز بلند کہا "آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں تنگ نظری دیس کے مستقبل کا صحیح تصور قائم نہ کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی فنا ہو جائیگی اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی خود ہندستانی کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں تک پہونچ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سچے ہندستانی مسلمان، اپنے مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لئے ہی بے بہا نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہندستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کئے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں۔ ہندستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں وہ ہندستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی اور نہ کوئی

مسلمان اپنے ہندی ہونے پر شرمائے، اور نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے ہندستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو، بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے وہ ان کے لئے عیب نہ ہو، بلکہ امتیاز بن جائے ۔"

ذاکر صاحب کے مذہبی عقیدہ کے اس تانے بانے میں، جب ذات پات مذہب زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا تھا۔ جب ریلوے اسٹیشنوں پر "مسلمان پانی" اور "ہندو دودھ" ملتا تھا۔ جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں بستی ہیں۔ جہاں مختلف انداز کے تمدن رائج ہیں، جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے، جہاں بت پرست اور بت شکن کو قدرت نے ساتھ جینے، اور مرنے کے لئے یک جا کر رکھا ہے اس ملک میں سب کے مل جل کر کام کرنے کی آس مشکل ہے۔ لیکن ان کا دل گواہی دیتا رہا کہ تھوڑے دن اور دھکے کھانے کے بعد اس ملک کے لوگ ضرور یکجا ہوں گے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہندستان کی قسمت میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ یہاں بالکل مخالف قسم کے انسانی گروہ ایک دوسرے سے مل کر ایک ایسا آدم تیار کریں جو ایک نئی تہذیب و تمدن کی تشکیل کر سکے اس بات پر ان کا دل کڑھتا تھا کہ ہم کب تک اسی سیاسی ریگستان میں ہل چلاتے رہیں کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں ہمارا دم گھٹتا رہے، اور کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت، اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دیگی ۔ ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں ؟ کیا اسی سماج میں جس میں بھائی بھائی ایک دل نظر نہیں آتے ۔ کوئی قدر آفریں قدر معلوم نہیں ہوتی ۔ جس میں کوئی گیت نہیں کہ سب مل کر گائیں کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں ۔ کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں ۔ کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں ۔ کیسے کھل کر سانس لیں ؟

ذاکر صاحب کی کوشش، اسی افتراق کو مٹانا، اور اسی گھٹن کو دور کرنا تھا ۔ انھیں یہ منظور نہ تھا کہ کوئی اپنی آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے اور چاروں طرف جو بیماری پھیلی ہوئی ہے اس سے غافل ہو جائے ۔ افلاس اور نکبت نے اجتماعی صحت کا جو حال کر رکھا ہے ذاکر صاحب

اس سے پریشان ہو جاتے تھے چنانچہ ایک جگہ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں "آہیں اتنی سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا، ان سے بھر جاتی ہے اور ہم انھیں سن نہیں سکتے، اور شاید اپنی زندگی گذارنے کے لیے یہی ٹھیک بھی ہوگا اس لیے کہ اگر احساس اتنا قوی ہو ہر آہ سنائی دے اور ہر دکھ دکھائی دے تو ایسا ہو جائے جیسے کوئی گھاس کے اُگنے اور بڑھنے کی آہٹ سننے لگے اور ہر جاندار کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگے اور شاید ہم اس ہیبتناک شور کی تاب نہ لا سکیں جو دنیا کے سناٹے میں چھپا ہوا ہے۔ ہمارے ذمہ ایک مہتم بالشان کام ہے۔ مضبوط دل اور بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام، اگر یہ کام ہم نہ کرسکیں تو ہمارے سینہ پر ہمیشہ یہ بوجھ رہے گا کہ ہم نے اپنے بنی نوع اپنے ہم قوموں کے افلاس، جہل، غلامی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر دھات کے کچھ سکے تو جمع کر لیے لیکن اپنی قوم کو ایک عذاب الیم سے نجات دلانے کے مبارک کام میں ہاتھ نہ بٹایا۔ دولت کے زنگ سے قومی زندگی کے جوہر کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی چیز اتنی موثر نہیں ہوتی جتنی کہ بے غرض کام کرنے والوں کا ایسا گروہ جو طوق زر کا آرزومند نہ ہو بلکہ جس کی ساری توجہ حق کی تلاش، سچ کے پرچار اور انسانوں کی خدمت کے لیے وقف ہو۔"

ذاکر صاحب کے یار غار پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے محب صادق کی طینت، فطرت اور سیرت کا تجزیہ ایک دلچسپ پیراگراف میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں" ذاکر صاحب نسلاً کھرے پٹھان تھے اور پیشہ اختیار کیا معلمی کا ..... اس لطیفہ پر کیا اختر شناس اس تم ظریفی کا انجام ظاہر ہے کیا ہوگا۔ ان کی قوم کے ایک فرد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ افلاس سے تنگ آکر خانہ نشین ہو گئے اور وہاں سے بیوی کے دمبدم طعنے اور شب و روز کے فاقہ سے نیم جان ہو کر بھیک مانگنے نکلے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کچھ یاد آیا واپس ہوئے۔ بیوی نے پوچھا کیا ہوا۔ بولے کھونٹی پر تلوار لٹکی ہے اسے لا دو ..... نیک بخت نے کہا، نکلے تو ہو بھیک مانگنے تلوار کیا کروگے، فرمایا اور کہیں غیرت ہو گئی تو کیا تلوار لینے گھر آؤں گا" ..... ذاکر صاحب بھی زندگی بھر تلوار لیے پھرتے رہے لیکن یہ تلوار عام تلواروں سے مختلف تھی، یہ صرف جھوٹ، کذب و افترا، انتشار

ذاتِ اقدس کے خلاف چلتی رہی ٹھیٹ پٹھانی انداز میں ـــــــــ لیکن سچائی صداقت اور لطافت کی محفلوں میں یہ کبھی میان سے باہر نہ نکلی۔

مرگِ بدن

اقبال نے کہا تھا کہ "مرگِ بدن" کے باوجود "روح" نہیں مرتی اور یہ بات ذاکر صاحب پر پوری طرح صادق آتی ہے ــ ایک دن آیا کہ ذاکر صاحب سارے ملک کو روتا بسورتا چھوڑ کر چل بسے۔

۳ مئی ۱۹۶۹ء کی بات ہے ہشاش بشاش بستر سے اٹھے، آدھی رات تک مطالعہ میں مصروف رہے تھے صبح اٹھ کر ایک گلاس دودھ پیا، کچھ کاغذات دیکھے، اور پھر بستر پر لیٹ کر ہندوستان کے دفاع پر ایک نئی کتاب پڑھنے میں محو ہوگئے۔ ۱۱ بجے کے قریب ڈاکٹر ان کے معائنہ کے لئے آئے تو معائنہ سے قبل باتھ روم گئے۔ باہر آنے میں جب زیادہ دیر ہوگئی تو ان کے پرانے ملازم اسحاق نے انھیں آواز دی مگر جب دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو ملازم کو تشویش ہوئی، اور اس نے باتھ روم کے پچھلے دروازہ سے اندر داخل ہو کر دیکھا صدر فرش پر بے ہوش و حواس پڑے ہیں۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد یہ فیصلہ سنایا کہ صدر جمہوریہ ہند اس دنیا میں نہیں رہے۔ ایوان صدر کا وہ پرچم جو گذشتہ ۲۲ برس میں کبھی نہیں جھکا تھا، ایک عظیم انسان کے سوگ میں سرنگوں کر دیا گیا۔

کیا کوئی ٹیگور نے پوچھا تھا "جس دن موت تمہارا دروازہ کھٹکھٹائے گی تو تم اپنے اس مہمان کی تواضع کیسے کروگے؟" اور پھر خود ہی جواب دیا تھا "میں اپنے مہمان کو خالی ہاتھ جانے نہیں دونگا، بلکہ اپنی حیاتِ مستعار کا لبالب جام اس کی خدمت میں پیش کرونگا بہار کے دنوں کی تر و تازگی، گرمی کی چاندنی راتوں کا حسن اپنی مصروف زندگی کی کمائی۔ یہ سب میں اس کے آگے پیش کردونگا۔"

ذاکر صاحب نے بھی موت کو خالی ہاتھ جانے نہ دیا۔ اپنی آخری سانسوں تک وہ

اکتساب علم میں مصروف رہے، اور جب موت آئی تو بڑے اطمینان سے اپنا سارا کیا دھرا" اس کے آگے رکھ دیا۔ ان کی موت ایک فرد کی موت نہ تھی، بلکہ ایک نسل کی موت تھی اس نسل کی جس نے گاندھی جی کے آدرش اور ان کی تعلیم کو اپنے کردار، اور اپنی شخصیت کا ایک جزو بنا لیا تھا، وہ اس کاروان کے ایک فرد تھے، جو زندگی نصب العین کی تکمیل کا ایک موقعہ سمجھتا رہا۔ خود انہوں نے کہا تھا کہ یہ سوچے بغیر کہ ہم اپنے مقصد کی تکمیل بھی کر سکیں گے یا نہیں، ہمیں اپنا کام جاری رکھنا چاہیئے یہ ضروری نہیں کہ زندگی ہمیں اپنی منزل مقصود تک پہونچنے کی مہلت دی، وہ تو "سفر مسلسل" کے نظریہ پر ایقان رکھتے تھے۔ راستہ میں "شجر سایہ دار" کی تلاش انھوں نے کبھی نہیں کی۔ بلاشبہ زندگی نے اتنی مہلت دی کہ، وہ اپنے مشن کی کامیابی کا نظارہ کر سکیں لیکن اس پر مطمئن ہو کر خاموش بیٹھے رہنا انھیں منظور نہ تھا اور اسی لئے آخری دم تک انھوں نے "مصاف زندگی" کے ایک مجاہد کی آن بان باقی و برقرار رکھی۔ ان کا ایقان تھا کہ تعلیم ہی قومی نصب العین کی تکمیل کا موثر ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اسی ایقان کے تحت وہ گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون میں شامل ہو گئے، اور انہوں نے انھوں نے ایک ایسی مثالی درسگاہ کے قیام کا تہیہ کر لیا جو صحیح معنوں میں قومی درسگاہ کہی جا سکے۔ جامعہ ملیہ ان کے اسی عزم و ایقان کا جیتا جاگتا مظہر ہے۔ سیاست کی ہنگامہ آرائی سے وہ دور رہے، کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ دریا جتنی تیزی سے چڑھتا ہے اتنی ہی تیزی سے اتر بھی جاتا ہے جب کہ تعلیم ایک لازوال سرچشمہ کی طرح گلستان افکار کو دائمی ترو تازگی عطا کرتی ہے۔ تعلیم میں بھی انہوں نے اس طبقہ کو "اذکار رفتہ" سے روشناس کرانے کا بیڑہ اٹھایا جس سے خود ان کا تعلق تھا۔ یہ درست ہے کہ جامعہ ملیہ کے دروازے بلا تفریق عقیدہ مذہب تمام تشنگان علم پر کھلے ہیں لیکن اسے "اسلامی تہذیب و ثقافت" کی مثالی و منفرد درسگاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ذاکر صاحب کو فرقہ دارانہ انداز سے سخت نفرت تھی، لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا ملک مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے اور جب تک ان میں سے ہر تہذیب و ثقافت کے اثرات اور اس کی دنیا کا غائر نظروں سے مطالعہ نہ کیا جائے، اس وقت تک قومی اتحاد و یکجہتی کے جذبہ کو فروغ دینا ممکن نہیں۔

وہ چاہتے تھے کہ اس ملک کی تمام تہذیبوں کو پھلنے پھولنے کے مساویانہ مواقع حاصل ہوں اور ہر تہذیبی گروہ، اپنی انفرادیت کو باقی و برقرار رکھتے ہوئے قومی اتحاد کا اہم عنصر بنا رہے جامعہ ملیہ کو انھوں نے اپنے اس انداز فکر کا آئینہ دار بنانے کی پوری کوشش کی، اور اپنی ساری زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی۔ اپنے نصب العین کی تکمیل میں ناکامی کا انھیں اس وقت شدید احساس ہوا جب کہ ۱۹۴۷ء میں غیر منقسمہ ہندستان، دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، اور فرقہ وارانہ فسادات کی آگ نے تہذیب، تعلیم اور شرافت کی تمام قدروں کو جھلس کر رکھ دیا۔ ایک مہذب اور شائستہ آدمی کی طرح انھوں نے ضمیر انسانی کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی اور فرقہ وارانہ جنون کے اس مرحلہ پر آواز دی کہ جس سرزمین کو تم گوتم، چشتی اور نانک کی سرزمین کا نام دیتے رہے ہو کیا اسی سرزمین پر بے قصور مردوں، عورتوں اور بچوں کے سر نیزوں پر اٹھائے، اپنی شجاعت و بہادری کا لوہا منوانا چاہتے ہو۔ توقع کے مطابق ان کی یہ شائستہ آواز سیاست کے جنگل میں گم ہو گئی لیکن ذاکر صاحب کے پاؤں نہیں لڑکھڑائے اور جب آگ اور خون کا یہ دور ختم ہوا تو علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے پھر ایک بار اپنے خواب کو تعبیر دینے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی یہ دوسری کوشش بھی بار آور نہ ہوئی پھر بھی وہ اپنے نصب العین سے منحرف نہیں ہوئے

اس عظیم ملک کے نائب صدر، اور بعد میں صدر جمہوریہ کے مناصب اعلیٰ پر فائز ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنے اس مشن کو جاری رکھا جو جامعہ ملیہ کی تاسیس کے دن شروع کیا گیا تھا۔ انہوں نے صدر جمہوریہ کی حیثیت سے صحتمند قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل پر اپنی ساری توجہات مرکوز کر رکھی تھیں۔ راشٹرپتی بھون کے در و دیوار شاہد ہیں کہ ہندستان کے اس شریف آدمی نے جمہوریہ ہند کی صدارت پر فائز ہونے کے بعد بھی کبر و نخوت کی پرچھائیوں سے اپنے آپ کو کتنا دور رکھا، اور اس عالیشان محل میں بھی ایک منکسر المزاج معلم کی طرح انھوں نے اپنی زندگی کس انداز میں گذاری، اپنے نصب العین کی شکست و ریخت اور اپنے خوابوں کے بکھر جانے کے باوجود بھی وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل رہے وہ، تو اس کے منتظر رہے

جب کہ راشٹرپتی کے خانہ باغ کے گلابوں کی طرح گلستانِ ہند کا ہر متنفس اپنے رنگ و بو کے اعتبار سے دیکھنے والوں کا مرکز نظر بن جائے۔

آزادی کا حصول ایک نئی قوم کی تعمیر و تشکیل سے زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے تو سو گنا زیادہ خلوص درکار ہوتا ہے۔ اور ذاکر حسین —— عبارت تھے اسی "خلوص بے پناہ" کے —— ان کی موت نے ہمیں ایک پرخلوص اور شریف آدمی سے محروم کر دیا۔ راشٹرپتی بھون کے اسی مکین نے، اپنی سرکاری قیام گاہ میں کتنے ہی گلابوں کی آبیاری کی۔ کتنے ہی پھول کھلائے، ہمیں توقع رکھنی چاہیئے کہ راشٹرپتی بھون کے ان گلابوں اور پھولوں کی طرح گلشن ہند میں بھی ذاکر حسین کی طرح صد رنگ پھول کھلتے اور ان کی خوشبو سے، اہل ہند کے اذہان و افکار مہکتے رہیں گے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند کے

اقوال زریں

۱ ۔ ہندوستان میں ایک ملا جلا سماج قائم ہے لہٰذا ایک آزاد ملک کی حیثیت سے قائم رہنے کے لیے بنیادی شرائط یہ ہیں ۔ اس سماج کے عوام کا مشترکہ قومی اور ثقافتی پس منظر ہو ۔ جس کی جڑیں تاریخ میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں اور اس کے علاوہ مختلف لسانی گروہوں میں روا داری اور پُرخلوص جذبہ کارفرما ہو

۲ ۔ چھوت چھات کا مکمل طور پر خاتمہ کرنا نہایت ضروری ہے ۔ ہمارے آئین کے رو سے بلا شبہ چھوت چھات کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے لیکن اسکے کچھ آثار ابھی تک ہمارے ذہنوں اور روزمرہ کی زندگیوں سے دور نہیں ہوئے ہیں

۳ ۔ ہمارے کام کا ایک اقتصادی پہلو ہے ۔ ہمیں اپنی ضرورتیں خود کم کرنی ہیں تاکہ ہماری حکومت ضرورت کے مطابق صنعتی وسائل کا استعمال کر سکے ۔ ہمیں قیمتوں کی سطح برقرار رکھنے اور منافع خوروں کو اُن کے مکروہ کاروبار سے باز رکھنے میں مدد کرنی ہے

۴ ۔ قومی زندگی کا محل کبھی مکمل نہیں ہوتا یہ ہمیشہ زیر تعمیر رہتا بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے اسکے وسیع تعمیراتی خاکوں کے اندر تفصیلات کو مستقل طور پر واضح کرتے رہنے کی ضرورت پڑتی ہے اسکے بے شمار عناصر کا بنیادی توازن قائم رکھنا پڑتا ہے کیوں کہ ان میں ہر عنصر تمام عناصر پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان سے اثر قبول بھی کرتا ہے

۵ ۔ اگر غلط باتوں کے ازالہ کے لیے خواہ وہ فرضی ہوں یا حقیقی تشدد کا استعمال بڑھتا رہا تو خود ملک کے اندر ہماری جمہوریت کی قدروں کے منتشر ہونے کا خطرہ پیدا ہوگا

جاری کردہ

ناظم اطلاعات تعلقات عامہ وسیاحت حکومت آندھرا پردیش